ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے شائقین کی تمنا کو شرفِ قبول عطا فرمایا کہ مولٰنا مولوی سلطان محمود صاحب صدر مدرس مدرسۂ عالیہ فتحپوری دہلی نے ہم لوگوں کے اصرار شدید پر قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور تفسیر کا نام

تسہیل البیان فی توضیح القرآن

تجویز فرما کر اس کے پہلے حصہ کی اشاعت کی اجازت بندے کو دیدی ہے اور اس حصہ میں دو چیزیں ہیں ایک مقدمہ جو نہایت ہی مختصر اور مفید عام ہے دوسرے

سورۂ فاتحہ کی تفسیر

مطبوعہ خواجہ برقی پریس دہلی ماہ شعبان ۱۳۵۴ھ

ملنے کا پتہ:- مولوی محمد شریف اللہ صاحب نائب صدر مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

الحمد للہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی فضل علی کثیر من خلقہ الانسان وخصہ بخصائص منہا النطق و البیان واختارہ لامانۃ الشرائع والعرفان وشرف ہذہ الامۃ بالفضائل والقراٰن والصلوٰۃ والسلام علی سید الانس والجان، افضل الرسل الذی بعث فی اٰخر الزمان النبی الامی صاحب المعراج والفرقان، محمد الذی لا یأتی مثلہ وما اتی الی الاٰن وعلی اٰلہ واصحابہ اجمعین الذین ہم نجوم الہدایۃ بالیقین الی یوم الحساب والدین،

اما بعد **مقدمہ** اس عاجز کو مناسب معلوم ہوا کہ اصل مقصد سے پہلے ایک مختصر سا مقدمہ لکھا جائے جس میں چند ایسے امور کی تفصیل کیجاوے جو آیندہ مقصد کے سمجھنے میں بصیرت پیدا کریں اور معین واقع ہوں اور ان کے ملحوظ رکھنے کے بعد مقصد میں دلچسپی پیدا ہو اور ان کو چند فصلوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔

فصل اوّل، اس فصل میں وجہ تالیف کا بیان ہے۔ بعض احباب نے بارہا یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک مختصر سی تفسیر اُردو زبان میں لکھدو مگر چند امور کی وجہ سے اُن کے ارشاد کی تعمیل نہ کرسکا۔ اوّل یہ کہ یہ کام بہت بڑا ہے اور میری ہمت اور استعداد اس قابل نہیں ہے کہ اس کو سرانجام دے سکوں۔ دوسرے یہ کہ اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ تراجم وتفاسیر ہر زبان میں بکثرت موجود ہیں خصوصاً ایسے حضرات کے کہ یہ خاکسار اُن کے سامنے ایک ادنیٰ طالب العلم کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ تیسرے دیگر مشاغل کی وجہ سے فرصت بھی نہیں تھی۔ لیکن اب ان احباب کے تقاضائے شدید اور دیگر چند وجوہ کی وجہ سے اس بات کی جرأت پیدا ہوئی کہ اس خدمت کا فخر حاصل کروں۔ اوّل یہ کہ قرآن کریم کے خدّام کی

فہرست میں اس ناچیز کا نام بھی درج ہو جائے کیونکہ اس فہرست میں نام کا درج ہو جانا بھی بہت بڑی سعادت ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ زمانہ میں گو تراجم وتفاسیر بکثرت موجود ہیں، لیکن صرف تراجم تو مقاصد قرآن کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہوتے خصوصاً عوام الناس اور انگریزی خوانوں کے لئے جو عربی زبان سے باقاعدہ واقف نہیں ہوتے، باقی رہی تفسیریں سو اُن کا حال یہ ہے کہ اکثر تو عربی زبان میں ہیں ان سے تو فقط علما ہی مستفید ہو سکتے ہیں اور جو اُردو میں ہیں ان کو اگرچہ اُردو خواں اور انگریزی خواں پڑھ سکتے ہیں لیکن بعض تو ان میں سے قابل اعتبار نہیں اور جو قابل اعتبار ہیں ان میں سے بعض طویل ہیں اور حشو وزوائد سے خالی نہیں ہیں اور بعض مختصر اور حشو وزوائد سے خالی بھی ہیں اور مطالب قرآنیہ کی تشریح بھی ان میں باقاعدہ کی گئی ہے لیکن وہ مغلق اسقدر ہیں کہ معمولی عربی داں بھی ان کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ تیسرے یہ کہ جسقدر تفاسیر اسوقت موجود ہیں باوجود کثرت کے ان میں کوئی تفسیر ایسی نہیں ہے جو اُردو میں بھی ہو اور ایسے سہل پیرایہ میں ہو کہ محض اُردو خوان اور انگریزی خواں بھی اس کا مطلب نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ لیں اور حشو وزوائد سے بھی خالی ہو اور طرز بیان میں موجودہ روشنی کے لوگوں کے مذاق کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو اور قرآن شریف کے مطالب کی تشریح میں اس امر کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو کہ قرآن شریف کو ایک دستور العمل بنا کر اُس پر عمل کیا جاوے تو اس کی کیا صورت ہوگی۔ لہٰذا ان باتوں پر نظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ ایک مختصر سی تفسیر لکھی جاوے جس میں امور مذکورۂ بالا کی رعایت رکھی جاوے واللہ الموفق۔

فصل دوم - اس فصل میں دو باتوں کا بیان ہے۔ ایک یہ کہ احکام شریعت کی تکلیف دینے کیلئے تمام مخلوق میں سے فقط حضرت انسان ہی کو منتخب کیا گیا ہے۔ دوسرے اس انتخاب کی وجہ۔ اور اس مسئلہ کی وضاحت سے غرض یہ ہے۔ کہ آئندہ جو تفسیر قرآن شریف کی لکھی جاویگی اسکو محض دل لگی سمجھکر نہ پڑھا جائے بلکہ یہ سمجھکر پڑھا جائے کہ یہ ایک دستور العمل ہے جس کے ہم

مکلف بنائے گئے ہیں اور اسی واسطے پیدا کئے گئے ہیں کہ اس کی تعمیل کریں اور اس کی تعمیل میں فوزِ دارین ہے اور اسکی خلاف ورزی میں خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہوں گے۔

حکمتِ خداوندی اس بات کی مقتضی تھی کہ مخلوق میں ایک ایسی ہستی بھی پیدا کیجاوے جسکو قانونِ شریعت کا مکلف بنایا جائے اور اس کی پیدائش کا مقصد اصلی فقط یہی ہو اور اس قانون کی موافقت ومخالفت پر جزا وسزا بھی مرتب ہو ورنہ یہ فعل عبث ہوگا جو حکمتِ خداوندی کے منافی ہے۔ حُسنِ اتفاق سے اس انتخاب کا قرعۂ ازلی حضرت انسان پر واقع ہوا اور اس کو اسی غرض کیلئے پیدا کیا گیا۔ چنانچہ اسی بنا پر ہر زمانہ میں حسب مصلحتِ وقت قانونِ شریعت نازل ہوتا رہا۔ اور بذریعہ انبیاء علیہم السلام اس کی اشاعت ہوتی رہی حتی کہ آخری قانون اور عالمگیر قانون قرآن شریف میں نازل ہوا۔ اور اس کی اشاعت بذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرائی گئی اور یہ قانون قرآن ناسخ ہے تمام قوانین کا اور اب تمام اہل دنیا کی کامیابی قیامت تک اسی کے اتباع میں منحصر ہے

وجہ انتخاب انسان برائے مکلف ساختن بقانونِ قرآن

اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے سوا کسی دوسری ہستی میں یہ قابلیت ہی نہیں ہے کہ اس کو قانونِ شریعت کا مکلف بنایا جاوے اس لئے کہ مکلف بنانے کیلئے ایسی ہستی کی ضرورت ہے جس میں دو باتیں ہوں ایک یہ کہ وہ ملکیت اور بہیمیت دونوں کو جامع ہو، یعنی اس میں خواص ملائکہ بھی ہوں اور خواص حیوانات بھی ہوں دوسرے یہ کہ اسمیں اطاعت وفرمانبرداری کا مادہ بھی ہو اور معصیت ونافرمانی کا مادہ بھی ہو۔ ورنہ مکلف بنانا عبث ہوگا، اور فعل عبث سے ذاتِ خداوندی پاک ہے اور ایسی ہستی فقط حضرت انسان ہی کی ہے کیونکہ ملائکہ میں خواص ملکیت تو ہیں لیکن خواص حیوانیت سے منزہ ہیں مثلاً کسی فرشتہ نے آج تک کسی کھانے یا پینے کی چیز کا مزہ تک بھی نہیں چکھا، کھانا اور پینا تو درکنار رہا۔ اور ایسا ہی لذتِ جماع ونیند وغیرہ سے بالکل ناآشنا اور محروم ہیں کیونکہ یہ چیزیں خواص حیوانیت کی

ہیں اور ملائکہ ان سے منزہ ہیں۔ اور انسان کے علاوہ باقی حیوانات میں خواص حیوانیت تو ہیں
لیکن وہ خواص ملکیت سے مبرّیٰ ہیں کیونکہ خواص ملکیت میں اصل دو امر ہیں ایک محبت الٰہی اور
عبادت خداوندی میں استغراق چنانچہ آیت یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ وغیرہ اسکی
شاہد ہے۔ دوسرے اقامت نظم چنانچہ فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا انہی کے حق میں وارد ہے اور
تمام حیوانات ان دو صفتوں سے خالی ہیں، آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا اور نہ دیکھیں گے
کہ گدھے یا گھوڑے وغیرہ مل کر ملائکہ کی طرح عبادت میں مشغول ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ گدھے
یا دیگر حیوانات دنیا میں نظم قائم کرسکیں اور حضرت انسان خواص ملائکہ و خواص حیوانات
دونوں سے مرکب ہے، حیوانوں کی طرح کھاتا پیتا بھی ہے اور لذت جماع و نیند وغیرہ سے
بھی مستفید ہوتا ہے اور کبھی کبھی شیر و بھیڑیے کا کام بھی کرنے لگتا ہے اور کسی وقت گربہ
مسکین بھی بن جاتا ہے اور جب عبادت مولیٰ میں مشغول ہوتا ہے تو فرشتہ ہے، اور اگر
اقامت نظم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو مدبّرات امر کا نظارہ بھی دکھا دیتا ہے۔ اور اسی طرح
ملائکہ میں بموجب آیت لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ فقط مادہ اطاعت
ہے مادۂ نافرمانی نہیں اور باقی حیوانات میں مادہ اطاعت نہیں بلکہ بوجہ فقدان عقل کے
اطاعت و معصیت کے معنی سمجھنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اور حضرت انسان میں دونوں
مادّے موجود ہیں اگر معصیت و نافرمانی پر کمر باندھ لے تو ابوجہل و ابولہب بھی بن سکتا ہے
اور اگر اطاعت و فرمانبرداری کا شیوہ اختیار کرے تو خلیل اللہ و حبیب اللہ وغیرہ کا خطاب
بھی اسی کو نصیب ہے۔ پس اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ احکام شرعیہ کے مکلف بنانے کے
قابل سوائے انسان کے اور کوئی ہستی نہیں ہے بلکہ اوروں کو مکلّف بنانا عبث ہے مثلاً
ملائکہ سے یہ کہنا کہ زنا نکرنا اور حرام چیزیں کھانے پینے وغیرہ کی استعمال نکرنا اور خرید و فروخت
میں قانون شرعی کی مخالفت نکرنا اور بیاہ شادی اور مرنے وغیرہ میں قانون شرعی
کی پابندی کرنا علی ہذا القیاس باقی احکام تو یہ بالکل عبث ہوگا کیونکہ وہ ان تمام چیزوں سے

منزہ ہیں وہ توان احکام میں جائز امر کی بھی طاقت نہیں رکھتے ناجائز تو درکنار رہا مثلاً
اگر آپ کسی فرشتہ سے یہ کہیں کہ فلاں عورت بڑی خوبصورت ہے اس سے شادی کرلو یا
یہ آم یا کھانا بڑا عمدہ ہے اس کو کھالو یا یہ شربت بڑا نفیس ہے اس کو پی لو تو وہ ہرگز
نہیں کرسکے گا تو اس کو زنا کرنے یا شراب پینے یا حرام کھانے وغیرہ سے روکنا بالکل عبث
ہوگا اور جو کام وہ کرسکتے ہیں مثلاً عبادت وغیرہ ان میں بھی نافرمانی کا صدور ان کر
ناممکن ہے کیونکہ ان میں نافرمانی کا مادّہ ہی نہیں توان کو مکلف بنانا محض عبث ہوگا۔
اور ایسا ہی دوسرے حیوانات کا مکلف بنانا بھی عبث ہوگا کیونکہ نہ توان کو عبادت
واقامتِ نظم کا مکلّف بنایا جاسکتا ہے اس لئے کہ یہ خواص ملکیت ہیں وہ ان سے منزہ
ہیں۔ چنانچہ مفصل گذرچکا ہے اور نہ ان کو قانونِ معاشرت و معاملات وغیرہ کا مکلّف
بنایا جاسکتا ہے کیونکہ وہ بوجہ فقدانِ عقل کے اس کے اہل ہی نہیں۔ پس حضرت انسان
کے سوا اس بوجھ اٹھانے کے قابل کوئی دوسری ہستی نہیں ہے۔ اس لئے اس کام کیلئے
اسی کو منتخب کیا گیا اور یہی معنی ہیں آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ کے یعنی تمام چیزوں کی
قابلیت واستعداد نے اس بوجھ کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان میں یہ قابلیت تھی اسلئے
اس نے اس بارِ گراں کو اپنے سر پر رکھ لیا۔ الحاصل انسان کی بناوٹ ہی ایسی بنائی گئی ہے
کہ وہ احکام شرعیہ کا مکلّف بنایا جاوے اور اس کو اسی غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔
اور یہی معنی ہیں آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے اور عبادت سے
مراد اس آیت میں مطلق اطاعت ہے جو شامل ہے تمام احکام کو۔

تنبیہ

اب اس امر کے واضح ہوجانے کے بعد انسان کو بیدار مغزی سے کام لینا چاہئے، ایسا
نہ ہو کہ اس فرض کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے مولائے حقیقی کی نظر میں ذلیل اور اس کے دربار سے

راندۂ درگاہ قرار دیا جائے اور آخرت میں جہنم رسید ہو کیونکہ یہ مقدمہ اظہر من الشمس ہے کہ جو چیز جس غرض کے لئے بنائی جاوے اگر وہ غرض اس سے پوری ہو تو وہ چیز مالک کی نظر میں عزیز ہوتی ہے اور اگر وہ غرض اس سے پوری نہ ہو تو مالک کی نظر میں ذلیل ہو جاتی ہے مثلاً گوشت اعلیٰ درجہ کا کھانے کیلئے تیار کیا گیا لیکن وہ سڑ گیا کھانیکے قابل نہیں رہا تو وہ مالک کی نظر میں اس قدر ذلیل ہو جائیگا کہ وہ اس کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ بلکہ کتوں کے آگے ڈلوائیگا علیٰ ہذا القیاس دوسری چیزیں، پس اگر انسان نے بھی وہ غرض پوری نہ کی جس کے لئے پیدا کیا گیا تھا (یعنی اطاعتِ خداوندی) تو وہ بھی بحکم مقدمہ مذکورہ اپنے مالک حقیقی کی نظر میں ذلیل و حقیر ہو جائے گا اور جہنم رسید کر دیا جائے گا۔

تنبیہ

مکلف ہونے میں انسان کے ساتھ جن بھی شریک ہیں جیسا کہ آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ و دیگر آیات سے صاف ظاہر ہے اور آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ الخ میں تخصیص ذکر انسان کی صرف اس لئے ہے کہ اس مقام میں کلام اُسی سے ہو رہا ہے۔

فصل سوم ۔ اس فصل میں خصوصیات قرآن کا بیان ہے یعنی وہ باتیں جو فقط قرآن شریف ہی میں پائی جاتی ہیں۔ کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتیں اور ان خصوصیات کے ملاحظہ کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ قانونِ قرآن مجید کی خوبی اور عظمت اور اسکی حقانیت خوب ذہن نشین ہو جائے گی اور اس کے پڑھنے کی رغبت اضعافاً مضاعفہ ہو جائے گی کیونکہ کسی چیز کی طرف رغبت کا زیادہ ہونا موقوف ہے اس کی خوبی اور عظمت معلوم ہونے پر۔

۱۔ اثبات دعویٰ نظریہ بدلائل عقلیہ

قرآن شریف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جو مسئلہ نظری یعنی محتاج الی الدلیل ہو اس کو نقلی دلائل کے علاوہ عقلی دلائل سے بھی ثابت کیا جاتا ہے اور ثبوت کو اس درجہ تک پہنچا دیا جاتا ہے کہ منصف مزاج کیلئے انکار کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی اور ضدی اور معاند کیلئے

تو دلائل ہوا ہی نہیں کرتے، دلائل سے تو منصف مزاج ہی فائدہ اٹھایا کرتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ باقی کتابوں کو باوجود آسمانی ہونے کے اس امر سے کیوں محروم رکھا تو اس کے متعلق اوّلاً یہ گذارش ہے کہ یہ معاملہ کتب ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ سب اشیا میں جاری ہے مثلاً حضرات انبیاء علیہم السّلام سب کے سب خداوند تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں لیکن خصوصیات جدا جدا رکھتے ہیں جیسا کہ آیت تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سے صاف ظاہر ہے اور ایسا ہی انسان سب خداوند تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن پھر خصوصیات علیحدہ علیحدہ رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح تمام حیوانات ونباتات وجمادات کے خصوصیات جدا جدا ہیں غرض تمام عالم کی بنیاد ہی اسی پر ہے پس یہ امر قابل اعتراض ہی نہیں کیونکہ سنّت الٰہیّہ کے موافق ہے اور ثانیاً اس میں خاص حکمت یہ ہے کہ سنت اللہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگوں کی فطرت اور استعداد کے موافق شریعت بھیجتے رہے ہیں اور ہر زمانہ میں لوگوں کی فطرت واستعداد یکساں نہیں رہی بلکہ اس میں تغیّر وتبدّل ہوتا رہا ہے، پس اسی کے موافق شریعت کا رنگ بھی بدلتا رہا ہے۔ زمانہ کی مثال ایک بچّے کی سی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ بچّے کے افہام وتفہیم کا طریقہ ابتدا سے لیکر جوان ہونے تک یکساں نہیں رہتا بلکہ بچے کی حالت بدلنے کے ساتھ ساتھ طریقہ افہام وتفہیم بھی بدلتا رہتا ہے مثلاً ایک وقت بچّے پر ایسا آتا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے سی کہ "ہوّا آیا" ڈر جاتا ہے اور رونے وچلّانے سی خاموش ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد یہ کہنا بیکار ہو جاتا ہے اور اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی چیز بلّی وغیرہ نظر آوے یا کوئی آواز سُنائی دے جب وہ مانتا ہے چنانچہ ماں کواڑ وغیرہ پر کوئی چیز مار کر یا بلّی وغیرہ کو دکھا کر یہ کہتی ہے کہ دیکھ یہ "ہوّا آیا" تو وہ ڈر کر خاموش ہو جاتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ طریقہ بھی بیکار ہو جاتا ہے اور اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ مار پیٹ سے اس کی خبر لیجاوے یا اس کو پیسہ وغیرہ کا لالچ دیا جاوے محض دھمکی اس کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور رفتہ رفتہ جب بالغ ہو جاتا ہے تو یہ تمام طریقے بیکار ہو جاتے ہیں نہ تو وہ کسی دھمکی

میں آتا ہے نہ لالچ کو مانتا ہے اور نہ مار پیٹ کام دے بلکہ مارنے پیٹنے میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ مقابلہ کرنے لگے اور ماں باپ کو مارنے لگے تو اسوقت اس کو سمجھانے کا فقط واحد ذریعہ ہے کہ اسکو دلائل عقلیہ سے سمجھایا جائے کہ بیٹا ایسا کرنے میں یہ نقصانات ہیں اور ایسا کرنے میں یہ فوائد ہیں اسی طرح زمانہ مثل تو زائیدہ بچے کے ہے، اسکی حالت بدلنے پر شریعت کا رنگ بھی بدلتا رہا حتی کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت آیا تو وہ وقت زمانہ کے بلوغ اور شباب کا تھا لہذا مصلحتِ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اس وقت کی شریعت دلائل عقلیہ سے پُر ہو اور مسائل نظریہ کو دلائل عقلیہ سے واضح کیا جاوے چنانچہ اس وقت آپ نئی روشنی کے لوگوں کو دیکھیئے کہ وہ کسی حکم کو بغیر دلیل عقلی کے ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اسی حکمت کی بنا پر قرآن شریف میں دلائل عقلیہ سے کام لیا گیا ہے یا یوں کہا جاوے کہ شریعت روحانی غذا ہے تو جس طرح جسمانی غذا میں حسبِ مصلحت وقت تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اسی طرح روحانی غذا میں بھی ہوتی رہتی ہے، مثلاً ایک زمانہ وہ تھا کہ بچے کیلئے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہ تھی اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ماں کے دودھ سے طبعاً نفرت ہوتی ہے، الحاصل روحانی غذا میں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کہ لوگوں کی حالت کے موافق ہو۔ اس بنا پر بھی مصلحتِ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ شریعت قرآنیہ میں دلائل عقلیہ سے کام لیا جاوے۔

(۲) اعجاز قرآن شریف

وصف اعجاز بھی قرآن شریف کے ساتھ مخصوص ہے کسی دوسری کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ ہر زمانہ میں خداوند تعالی کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو حسبِ مصلحت وقت مختلف معجزات عطا ہوتے رہے ہیں تاکہ وہ حضرات ان معجزات کے ذریعہ سے اپنی صداقت کا ثبوت دے سکیں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضاء عطا کیا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو مُردوں کا زندہ کرنا اور مادر زاد اندھوں کو اور برص کے بیماروں کو اچھا کرنا اور گارے کے جانور بنا کر اڑانا وغیرہ عطا ہوا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعجاز قرآن عطا ہوا یعنی ایسی کتاب

عطا فرمائی کہ اس میں وصف اعجاز رکھدیا گیا۔

اور معجزہ چونکہ نبی کے دعوی نبوت کی صداقت کی دلیل ہوتا ہے لہذا قرآن شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی کامل دلیل ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ نے سورہ یٰسین کے ابتدا میں آپ کی نبوت پر قرآن شریف ہی کو دلیل بنایا ہے وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ، اور سورہ بقر کی آیت وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا الخ میں بھی اس کی تشریح آئے گی۔ جس قدر معجزات انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوئے ہیں ان حضرات کے تشریف لیجانے کے بعد ان معجزات کا وجود باقی نہیں رہا صرف ذکر باقی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یعنی قرآن مجید آپ کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد بھی تا قیامت باقی رہے گا۔ جب کسی کا جی چاہے آپ کی صداقت کی دلیل دیکھ لے۔

معجزہ عربی لفظ ہے جس کا مصدر اعجاز ہے۔ اعجاز کے معنی عاجز کر دینے اور ہرا دینے کے ہیں یعنی نبی ایک ایسا کام کرکے دکھاتا ہے کہ اور لوگ اس کام کے کرنے سے عاجز آجاتے ہیں اور اس کام میں نبی کا مقابلہ کرنے میں ہار جاتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ دعوی نبوت میں صادق ہے اور قرآن شریف میں وصف اعجاز رکھنے کی مصلحت خاکسار کے رسالہ "ضرورت رسالت" میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

(۳) حفاظتِ قرآن شریف از تغیّر و تبدّل

کوئی آسمانی کتاب دنیا میں آنے کے بعد تغیر و تبدل سے محفوظ نہیں رہی لیکن قرآن شریف قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اور یہ بھی قرآن شریف کا ایک معجزہ ہے۔ سوائے وصف اعجاز کے اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اور آیت وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ الخ میں قرآن شریف کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اس لئے اس میں تغیر و تبدل کا وقوع قیامت تک ناممکن ہے

حکمت حفاظتِ از تغیّر و تبدّل

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن شریف خاتم الکتب ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اور قرآن شریف کے بعد کوئی کتاب نہیں آسکتی۔ پس اگر قرآن شریف کو تغیر و تبدل سے محفوظ نہ رکھا جاوے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قیامت تک لوگوں کو طریقہ ہدایت سے محروم رکھا جائے اور ہمیشہ گمراہی میں ہی مبتلا رہیں، اس لئے کہ قرآن شریف تو تغیر و تبدل کے بعد ہدایت کا کام دے نہیں سکتا۔ اور دوسرا کوئی نبی یا کتاب آ نہیں سکتی، پس لوگ ہمیشہ طریقہ ہدایت سے محروم رہیں گے اور یہ امر رحمتِ خداوندی کے خلاف ہے، پس یا تو سلسلہ نبوت کو بند نہ کیا جائے تاکہ قرآن شریف کے متغیر ہونے کے بعد دوسرا نبی بھیجکر لوگوں کو صحیح راستہ ہدایت دکھایا جائے اور یا قرآن شریف کو محفوظ رکھا جائے تاکہ سلسلہ نبوت ختم ہونے کے باوجود بھی لوگ ہدایت سے محروم نہ رہیں اور یہ بات رحمتِ خداوندی سے بہت دور ہے کہ سلسلہ نبوت بھی بند کر دے اور قرآن شریف کو بھی محفوظ نہ رکھے، لہذا جب بتقاضائے مصلحت سلسلہ نبوت کو بند کر دیا گیا تو قرآن شریف کی حفاظت کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔ پس قرآن شریف کی حفاظت بھی ایک دلیل ہے ختم نبوت کی۔

تشریح کیفیت حفاظت

قرآن شریف کی حفاظت تو بتقاضائے مصلحت آلہیہ لازم تھی ہی لیکن اس حفاظت کی جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ بھی قرآن شریف کا ایک مستقل معجزہ ہے جو قرآن مجید کے سوا کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا، قرآن شریف کا فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہونا تو خاص طور پر اہل عرب ہی سمجھ سکتے ہیں یا وہ لوگ جو عربی زبان میں ماہر ہوں لیکن صورت حفاظت ایک ایسا معجزہ ہے کہ ہر ملک کا باشندہ اور خواندہ اور ناخواندہ سب سمجھ سکتے ہیں۔

وعدہ حفاظت کے پورا کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی تھیں لیکن قرعہ ازلی کے انتخاب میں یہ خدمت اُمّت مرحومہ کے قلوب کے سپرد کی گئی اور سب سے پہلے یہ دولت نبی اُمّی علیہ التحیات والتسلیمات کے سینۂ اقدس میں رکھی گئی اور اس کے بعد تاقیامت اس دولت کی

حفاظت کا ذریعہ لوگوں کے سینوں ہی کو قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں قرآن شریف
کے حفاظ لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور تا قیامت پائے جائیں گے۔ لیکن کسی دوسری
کتاب کا ایک حافظ ملنا بھی دشوار ہے۔ مثلاً اگر اس بات کا اعلان کیا جاوے کہ انجیل یا
توراۃ کے ہر حافظ کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیں گے جو سناتا جائے انعام لیتا جائے تو غالباً ایک
عیسائی یا یہودی بھی ایسا نہیں ملیگا جو اس انعام کو لے سکے علیٰ ہذا القیاس باقی کتابیں۔
لیکن قرآن شریف کے متعلق اگر یہ اعلان کیا جائے کہ فی حافظ صرف ایک روپیہ انعام دیا جائیگا
جو سناتا جاوے انعام لیتا جاوے تو بلا مبالغہ اسقدر حفاظ جمع ہو جائیں گے کہ ایک ایک روپیہ
لیکر بھی خزانہ خالی کر دیں گے کیا قرآن شریف کا یہ معجزہ اظہر من الشمس نہیں ہے، پھر طرہ یہ ہے کہ ایسے
ایسے لوگ حافظ نکلیں گے جو بالکل بے لکھے پڑھے بلکہ اپنا نام تک بھی لکھنا نہیں جانتے اور چھوٹے
چھوٹے بچے کثرت سے محراب سناتے ملیں گے۔ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بے پڑھے
لکھے حافظ زیادہ ہوتے ہیں اور علما بہت کم حافظ ہوتے ہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
تقسیم فرمادی ہے کہ معانی کی حفاظت علما کریں اور الفاظ کی حفاظت ناخواندہ کریں تاکہ خواندہ
وناخواندہ دونوں اس دولت سے محروم نہ رہیں۔ اور یہ طریقہ حفاظت کا ایسا ہے کہ اس میں کسی
چور یا ڈاکو کا قابو ہی نہیں چل سکتا اگر کوئی دشمن گھر میں گھس کر تمام سامان لیلے اور بڑے سے بڑے
سنگین صندوق توڑ کر مال نکالے تو یہ ممکن ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن شریف کا صندوق
توڑ کر اس کو چرا سکے سبحان اللہ کیا عجیب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اگر دشمنان قرآن شریف
(العیاذ باللہ) دنیا سے مٹانے کی غرض سے تمام نسخے قرآن شریف کے پانی سے دھو دیں یا
کسی دوسری صورت سے نیست و نابود کر دیں تو غیر ممکن ہے کہ قرآن شریف دنیا سے مٹ سکے،
کیونکہ کاغذ پر لکھا ہوا تو مٹ سکتا ہے لیکن سینوں میں لکھا ہوا کیسے مٹ جائیگا۔ رب العزۃ
اپنے حبیب پاک کو اظہار احسان کے طور پر فرماتے ہیں انزلت علیک کتاباً لا یغسلہ الماء
تقرأہ نائماً ویقظان رواہ مسلم۔ کہ میں نے آپ پر ایسی کتاب نازل فرمائی ہے کہ اسکو پانی نہیں

دہو سکتا (کیونکہ وہ آپ کے قلب پر لکھدی گئی ہے وہاں پانی کی رسائی نہیں ہے) آپ اسکو سوتے ہوئے جاگتے ہوئے (ہر حالت میں) پڑھ لیں گے۔

الحاصل قرآن شریف ایسی جگہ میں رکھا گیا ہے کہ کسی مٹانے والے کا وہاں بس ہی نہیں چل سکتا اور تا قیامت انشاء اللہ تعالیٰ ایک نقطہ یا زیر و زبر تک کا تغیر بھی نہیں آنے پائے گا، حروف و کلمات کا تغیر تو درکنار رہا۔ کیا عجیب کرشمہ ہے قدرت خداوندی کا کہ دشمنانِ اسلام جو قرآن شریف کو مٹانا چاہتے ہیں اُن سے ہی حفاظت کرائی جاتی ہے بعض عیسائی یا آریہ ایسے پائے جاتے ہیں کہ ان کو اپنی کتاب تو یاد نہیں ہے لیکن قرآن شریف کا بہت بڑا حصّہ یاد ہے اگر کوئی مولوی صاحب اُن سے مناظرہ کے وقت غلط آیت پڑھتا ہے تو وہ بتاتے ہیں کہ مولانا آیت اس طرح نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے۔ غرض قرآن شریف کا یہ معجزہ ایسا واضح ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے، اب بھی اگر کوئی نہ مانے تو وہ جانے اور اس کا انصاف،

(۴) عموم شریعت و دوام شریعت

یعنی شریعت قرآنیہ کسی خاص قوم یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے جن وانس کیلئے ہے اور باقی شریعتیں خاص خاص قوموں یا ملکوں کے لئے تھیں اور اسی طرح شریعت قرآنیہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک بدستور باقی رہے گی اور باقی شریعتیں خاص خاص وقتوں کے ساتھ مخصوص تھیں حتی کہ شریعت قرآنیہ کے آنے کے بعد سب منسوخ ہو گئیں اور اس عموم دعوت اور دوام دعوت کی تفصیل خاکسار کے رسالہ ضرورت رسالت میں ملاحظہ فرمالیجائے وہاں دلائل عقلیہ و نقلیہ سے اس مسئلہ کو واضح کر دیا گیا ہے اسی وجہ سے اس مقام پر ان کو ذکر نہیں کیا گیا۔

شریعت قرآنیہ چونکہ تمام دنیا کے لئے تھی اس لئے اس میں کوئی صیغہ غیر مکمل نہیں چھوڑا گیا اور ہر صیغہ کے قواعد کی تشریح و تفصیل مصلحت عامہ کو ملحوظ رکھکر کی گئی ہے۔ الحاصل تمام دنیا کو ایک مرکز پر لانے اور ایک حکومت کے ماتحت چلانے کیلئے جس قانون کی ضرورت ہے

وہ ہے قانونِ قرآن - اہلِ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ صلاحیت قرآن شریف کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے اور ان کے پاس اس دعویٰ کے دلائل ہیں جو روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہیں چنانچہ اثبات دعویٰ کیلئے جس قدر دلائل دیئے جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ واضح مشاہدہ ہے - مشاہدہ سے بڑھکر کوئی دلیل زیادہ واضح نہیں ہوتی، اور اس امر کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ قانون قرآن میں دنیا کو ایک حکومت کے ماتحت رکھکر چلانے کی صلاحیت علی وجہ الکمال ہے کیونکہ قیصر و کسریٰ جیسی سلطنتیں برسوں قانون قرآن کی غلامی میں رہ چکی ہیں - اور خود قوانین و قواعد قرآنیہ کی وضع میں غور کرنے کے بعد عاقل کو کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ سورج کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دعویٰ صادق ہے چنانچہ عنقریب تفسیر شروع ہونے پر انشاءاللہ تعالیٰ یہ امر واضح ہو جائیگا - اور (ضرورت رسالت) میں بھی اس مسئلہ کی قدرے وضاحت کی گئی ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے اور بعض مخالفین کا یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقط قطعۂ عرب ہی کے لئے نبی تھے اور بعض آیات قرآنیہ مثل تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ وغیرہ سے استدلال کرنا بالکل غلط ہے اور قرآن شریف کے معانی اور مراد سے ناآشنا ہونے پر مبنی ہے چنانچہ آئندہ مضمون سے یہ امر واضح ہو جائے گا -

انتخاب عرب برائے تعلیم قرآن شریف

قرآن شریف چونکہ تمام اقوام عالم کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا اور اظہر من الشمس ہے کہ تمام دنیا کی ہدایت و اصلاح براہِ راست ایک شخص سے ناممکن ہے اگرچہ اس کو ہزار سال سے بھی زیادہ عمر دی جائے خصوصاً ایسے شخص سے کہ اس کو فقط تیئیس ۲۳ سال اس کام کیلئے دیئے جائیں - اور اسباب سفر یعنی ہوائی جہاز و موٹر وغیرہ بھی نہ رکھتا ہو، لہذا مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ پہلے ایک قوم منتخب کر کے اس کو قرآن شریف کی تعلیم دی جائے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس قوم کو اپنا دست و بازو بنا کر اس کے ذریعہ سے

تمام دنیا میں اشاعتِ قرآن کریں اور بمقتضائے حکمت اس کام کیلئے قطعہ عرب کو منتخب کیا گیا لہذا رحمۃ للعالمین کو مکہ معظمہ میں قوم قریش میں مبعوث کیا گیا اور قطعہ عرب کے انتخاب میں متعدد حکمتیں تھیں۔

حکمتِ اول سُنّت الٰہیہ یہ ہے کہ اپنے بندوں کی اصلاح کیلئے ہر کام میں وہ راستہ تجویز فرماتے ہیں جو تمام راستوں سے زیادہ آسان و مختصر ہو، اس حکمت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مکہ معظمہ سے بہتر اور کوئی قطعہ زمین کا نہیں تھا۔ اس لئے کہ جس نبی کو تمام دنیا کی اصلاح کرنی ہو اس کی بعثت کیلئے وہ جگہ منتخب ہونی چاہئے جو تمام دنیا کے وسط میں ہو تاکہ ہر طرف آسانی سے پہونچ سکے اگر اس کو ایک کنارے پر کھڑا کیا جاوے تو اس کو بہت بڑی دقت پیش آویگی۔ اور تمام زمین کا وسط اور مرکز بیت اللہ ہے امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قالوا الکعبۃ سرۃ الارض و وسطہا خانہ کعبہ زمین کی ناف ہے لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ میں مبعوث فرما کر قرآن شریف کی تعلیم شروع کرائی گئی۔

حکمتِ دوم اس کام کے لئے ایک قوم کا انتخاب تو ضروری تھا جسکی وجہ اوپر گذر چکی ہے لیکن مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ قوم منتخب کیجائے جو مقصد بعثت کے پورا کرنے میں زیادہ انفع ہو اور وہ مقصد تمام دنیا کی قومونکی اصلاح اور اقطار عالم میں قرآن شریف کی اشاعت ہے لہذا پہلے ایسی قوم منتخب ہونی چاہئے جو دنیا بھر کی قوموں سے زیادہ بہادر اور قوی ہو اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قوم کی اصلاح میں بہت زیادہ دقتیں اُٹھانی پڑیں کیونکہ اس بہادر قوم کی اصلاح ہو جانے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوموں کو ٹھیک کردے گی بیشک اس قوم کا ٹھیک کرنا بہت ہی مشکل ہوگا کیونکہ وہ بوجہ قوت و شجاعت کے آسانی سے اطاعت قبول نہیں کرے گی لیکن جب ٹھیک ہو جائے گی تو دنیا بھر کی قومیں اس کے آگے سر تسلیم خم کردیں گی یہ بات بھی قطعہ عرب ہی میں پائی جاتی تھی۔ قطعہ عرب دنیا بھر کی قوموں سے زیادہ بہادر تھا، خصوصاً قوم قریش بہادری میں تمام قطعہ عرب میں ممتاز تھی،

اس مصلحت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش میں مبعوث کیا گیا۔

آپ کو ان لوگوں کی اصلاح میں جو دقتیں اُٹھانی پڑیں وہ محتاج بیان نہیں مگر اس قوم نے اصلاح پذیر ہونے کے بعد جو دنیا کی اصلاح کا کام کیا ہے وہ بھی اظہر من الشمس ہے ان لوگوں نے قیصر و کسریٰ کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اور تمام دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نہ تھی جو ان کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکے۔ بہت تھوڑے عرصہ میں اسلام دنیا میں پھیل گیا اور گھر گھر میں قرآن شریف کی تعلیم ہونے لگی۔

مثلاً اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہندوستان میں مبعوث کیا جاتا تو ہندوستان کی اصلاح میں آپ کو اتنی دقت پیش نہ آتی جتنی عرب کی اصلاح میں پیش آئی۔ لیکن اسلام رہتا ہمیشہ ہندوستان ہی میں۔ ہندوستان کے حدود سے آگے تجاوز نہ کرتا تو گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تکلیف کم ہوتی لیکن آپ کی بعثت کا جو مقصد تھا (یعنی تمام دنیا میں اسلام پھیلانا) وہ ہرگز حاصل نہ ہوتا کیونکہ ہندوستان کے لوگ اس قابل نہیں تھے کہ بڑی بڑی بہادر قوموں کا مقابلہ کر سکتے، یہ عرب ہی کا کام تھا کہ فاقوں کے مارے پیٹ پر پتھر باندھے ہوتے تھے لیکن جب تلوار لیکر کھڑے ہوتے تھے تو پہاڑوں کو ہلا دیتے تھے۔ غرض ان کے کارنامے محتاج بیان نہیں ہیں۔

حکمت سوم قطعہ عرب نعمتِ نبوت اور آسمانی ہدایت سے زمانہ دراز سے محروم چلا آرہا تھا اور یہود جو ملک شام میں آباد تھے اور ان لوگوں کے چچازاد بھائی تھے کیونکہ عرب بنی اسمٰعیل ہیں اور یہود بنی اسحاق ہیں۔ وہ آباء و اجداد سے نعمت نبوت و ہدایت آسمانی سے بہرہ یاب تھے عرب کے لوگ جب ملک شام میں بغرض تجارت جاتے تھے تو یہود کی طرف حسرت کی نگاہ سے اس طرح دیکھا کرتے تھے جس طرح ایک محتاج جو آباؤ اجداد سے محتاج چلا آرہا ہو ان لوگوں کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو نسلاً بعد نسل اغنیا چلے آرہے ہوں۔ عرب کو اسی وجہ سے اُمیین (یعنی ناخواندے) کہا جاتا تھا کہ وہ زمانہ دراز سے نعمتِ نبوت اور ہدایت آسمانی سے

محروم چلے آرہے تھے پس رحمت الٰہیہ کو جوش آیا کہ ان کی سینکڑوں برس کی محرومی کو دور کرکے دولتِ نبوت وہدایت آسمانی سے سرافراز فرماوے۔

یا بعبارت دیگر یوں کہا جائے کہ وہ امراض روحانیہ جن کا علاج کرنے کی غرض سے انبیاء علیہم السلام آسمانی ہدایت دیکر بھیجے جاتے ہیں وہ امراض قطعہ عرب میں انتہار کو پہونچگئے تھی، حتی کہ بیت اللہ جیسی پاک جگہ بیت الاصنام بنی ہوئی تھی اور ایسے ہی باقی خرابیاں بھی حد سے گذر گئی تھیں اور اسکی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ لوگ زمانہ دراز سے ہدایت آسمانی اور دولتِ نبوت سے محروم تھے صدیوں سے کوئی مصلح ان کے پاس نہیں آیا تھا الحاصل یہ لوگ روحانی ڈاکٹر کے اوروں کی بہ نسبت زیادہ محتاج تھے لہذا ان کی حالت زار نے بزبان حال دربار خداوندی میں دستِ دعا دراز کرکے رُوحانی ڈاکٹر کی درخواست کی اور رحمتِ خداوندی نے فوراً بموجب اُجِیبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ منظوری فرماکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور نسخہ ہدایت یعنی قرآن شریف اُن کے علاج کیلئے عطا فرمایا۔

فصل چہارم ۔ اس فصل میں وہ امور ذکر کئے گئے ہیں جن کا تفسیر ہیں لحاظ رکھا جائیگا

(۱) حشو وزوائد سے بالکل اجتناب کیا جائے گا۔ صرف مقاصد کی تشریح کو مدِ نظر رکھا جائیگا اور تشریح مقاصد بھی ایسے سہل پیرایہ میں کہ عوام بھی مستفید ہوسکیں۔

(۲) لغوی تحقیقات اور معانی کے نکات اور نحوی ترکیبات وغیرہ کی طرف بھی توجہ نہیں کیجائے گی اس لئے کہ عوام کو نہ تو اس سے دلچسپی اور نہ اس کی ضرورت، اور خواص کو گو اس سے دلچسپی ہے لیکن خاکسار کی جو تفسیر لکھنے سی غرض ہے اول تو یہ چیزیں اس سے خارج ہیں دوسرے موجودہ تفاسیر نے اس سے مستغنی کردیا ہے۔ جن حضرات کو ضرورت ہوگی وہاں ملاحظہ فرمالیں گے اور تیسرے خوف طوالت بھی ان چیزوں کے ذکر سے مانع ہے، البتہ خاص خاص مقاموں میں کوئی چیز مناسب مقام لکھدی جاویگی۔

(۳) مسائل اختلافیہ فقہیہ میں بھی وقت نہیں دیا جائیگا اس لئے کہ کتب فقہ سے

اس سے مستغنی کر دیا ہے البتہ جو مسئلہ آیات میں آجائے گا اس کی تشریح بقدر ضرورت کر دی جائیگی۔

(۴) مذاہب باطلہ یعنی جو مذاہب اسلام سے خارج ہیں ان کا رد مناسب مقامات میں بقدر ضرورت کیا جائیگا۔

(۵) تفسیر لکھنے سے غرض اصلی خاکسار کی یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی غفلت جو قرآن شریف کے متعلق ہے اس کو دور کر دیا جاوے اور ان کو قرآن شریف کی صحیح حقیقت اور قیمت سے مطلع کر دیا جاوے۔ کیونکہ عام طور پر مسلمان یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن شریف صرف بیماروں کو ہوا دینے کیلئے یا پڑھ کر دم کرنے کیلئے یا میت کے اسقاط کیلئے یا اس کی قبر پر پڑھوانے کیلئے یا زیادہ سے زیادہ نماز میں پڑھنے کیلئے ہے۔ حالانکہ قرآن شریف کے نزول سے اصلی غرض یہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسا دستور العمل اور شاہراہ بتایا جاوے جس کو عمل میں لاکر دنیا میں بحکم آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ بادشاہ بلکہ شاہنشاہ بنکر رہیں۔ دنیاوی ترقی میں خلافت کبریٰ تک پہنچنا بھی خصوصیات قرآن میں سے ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سورۂ نصر کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"مخلات دین حق در راہ راست چہار چیز است اول نفس۔ دوم شیطان، سوم کفار کہ بر ہیم شوکت و غلبہ باشند، چہارم منافقان و بد باطنان کہ بطریق موشک دوانی القائے شبہات نمائند و انبیائے سابق برائے دفع شر نفس و شیطان مبعوث می شدند زیرا کہ شر این ہر دو اصل ہمہ شرور است و کفار و منافقان نیز تابع این ہر دو و در بعثت آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم این طور منظور افتاد کہ دفع ہر چہار چیز بالاستقلال نمودہ آید و لہذا فوج کشی و جہاد و ملک گیری و ملک داری و طریق سیاست مفسدان و باغیان و قطاع الطریق و اقامت حدود و تعزیرات بر مرتکبان معاصی در صلب دین ایشان داخل شد و صورت این شریعت صورت بادشاہت گردید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم از ابتدائے بعثت بتدریج نبوت را ترقی دادہ تا سر حد خلافت کبریٰ رسانید ند الخ۔" اور آخرت میں بحکم آیت اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ

الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ جنت الفردوس کے وارث ہیں پس مقصود بالذات تفسیر میں قرآن شریف کے دستور العمل ہونے کی شرح ہے لہذا حتی الامکان اس کی وضاحت کی پوری کوشش کیجاویگی اور باقی امور کی طرف توجہ نہیں کیجاویگی اور موجودہ تفاسیر کے ہوتے ہوئے اُن کے بیان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ **تنبیہ** چونکہ قرآن شریف کی بعض آیات پر سائنس دانوں نے حملے کئے ہیں اسلئے مسلمانوں کی جو اعلی تعلیم گاہیں قائم ہوئی ہیں ان میں مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ آدمی تیار کئے جائیں کہ وہ فلسفیانہ شبہات کا جواب دے سکیں اور سائنس کے حملوں کو روک سکیں لیکن یہ چیز گو مفید ہے لیکن نمبر دوم ہے۔ اصل چیز یہی ہے کہ قرآن شریف کو ایسے رنگ میں پڑھیں کہ قابل عمل ہو جائے اور اسکو دستور العمل بنا کر آئندہ ترقی کر سکیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں کبھی سائنس کے مسائل کا تذکرہ تک نہیں ہوا حالانکہ دن رات قرآن شریف ہی کی تعلیم کی کوشش کرتے رہے۔ اور جب سے مسلمان اس سے غافل ہوئے ہیں اُسی وقت سے تباہی میں ہیں۔

(۶) ربط کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے گا۔ ہر سورت کا دوسری سورت کے ساتھ بھی اور ہر آیت کا دوسری آیت کے ساتھ بھی لیکن اس کی صورت یہ ہوگی کہ مضمون کا طرز بیان ایسا اختیار کیا جائیگا کہ اس کے ملاحظہ کرنیکے بعد اس سوال کی نوبت ہی نہ آنے پائے کہ اس آیت کا ماقبل سے کیا تعلق ہے بلکہ مضمون کی روانگی خود بتلاتی جاوے گی کہ یوں ہی ہونا چاہیئے کیونکہ قرآن شریف کے مضامین آپسمیں ایسے مرتبط ہیں کہ بے ارتباطی ان سے کوسوں دُور ہے۔

فصل پنجم

اس فصل میں چند ایسے مقدمات ذکر کئے جاتے ہیں جو مقاصد کے سمجھنے میں بصیرت پیدا کرتے ہیں اور بعض مقامات کی تفسیر سمجھنے میں سہولت پیدا کرتے ہیں۔

پہلا مقدمہ ۔ جس طرح انسان کا تعلق والدین کے ساتھ ایک فطرتی امر ہے اسی طرح انسان کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ بھی بحکم آیت فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

اور بحکم حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ الخ فطرتی امر ہے یعنی جس طرح کہ ہر انسان کی پیدائش میں یہ جذبہ رکھا گیا ہے کہ وہ بغیر کسی تعلیم کے والدین کو پہچانتا اور طبعاً اُن کی طرف میلان رکھتا ہے حتی کہ چندماہ کے بعد بچّہ میں یہ امر مشاہدہ کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اسوقت تعلیم و تعلم کا اصلاً اہل نہیں ہے۔ اسی طرح خالق کی معرفت کا مادّہ اور اسکی طرف میلان طبعی ہر انسان کی پیدائش میں رکھا گیا ہے۔ **اعتراض** اگر انسان کا تعلق خالق کے ساتھ فطرتی ہوتا تو پھر غیر اللہ کی طرف ہرگز متوجہ نہوتا اور کسی کو اس کے ساتھ شریک بھی نکرتا اور مشاہدہ اس کے خلاف ہے پس معلوم ہوا کہ تعلق فطرتی نہ تھا۔ **الزامی جواب** یہی اعتراض بعینہٖ والدین کے تعلق پر بھی وارد ہوتا ہے کیونکہ یہ امر مشاہدہ میں آچکا ہے کہ جس والدہ کی گود کسی زمانہ میں جنت کا نمونہ بھی بعض حضرات اس کو مارپیٹ کر گھر سے نکالدیتے ہیں اور اس کی صورت کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے اور اسی طرح جس والد کو کسی زمانہ میں ہر آفت سے پناہ گزین ہونے کیلئے حصن حصین سمجھا جاتا تھا بعض ہستیاں اس کو ذلیل و خوار کر کے گھر سے نکالدیتی ہیں۔ اور اس کی صورت سے بھی بیزار ہوتی ہیں۔ حالانکہ والدین کے ساتھ تعلق کا فطرتی ہونا بدیہی ہے اس میں انکار کی گنجائش ہی نہیں پس جو جواب یہاں ہے وہی جواب وہاں ہے۔

تحقیقی جواب۔ انسان کا تعلق تو دونوں جگہ فطرتی ہی ہے لیکن انسان جب دنیا میں آکر آنکھیں کھولتا ہے اور خارجی اشیائے سے متاثر ہوتا ہے تو بعض اوقات اسباب خارجیہ ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ اس فطرتی تعلق کو کمزور کردیتے ہیں حتی کہ بعض اوقات غلبۂ اسباب خارجیّہ کی وجہ سے وہ فطرتی تعلق بالکل فنا ہوجاتا ہے مثلاً بعض حضرات پر شادی ہونے کے بعد جورو کی محبّت اسقدر غالب ہوجاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں والدین کی پروا نہیں کرتے بلکہ اس کے کہنے سے والدین سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اسی طرح بعض اوقات ایسے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں جو خالق کے تعلق کو کمزور یا فنا کردیتے ہیں اور اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکورہ بالا کے آخری حصّہ میں ثمّ ابواہ یھودانہٖ

یعنی ہر بچہ میں پیدا ہونے کے وقت خدا شناسی کا مادہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے بعد اسباب خارجیہ ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ اس مادہ کو دباکر اسکو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں اور منجملہ ان اسباب کے والدین چونکہ سببِ اکثری ہیں اسواسطے حدیث میں ان کا ذکر تخصیص کے ساتھ کیا گیا ہے ورنہ حصر مقصود نہیں ہے۔

دوسرا مقدمہ مذہب کی دعوت فقط اُن لوگوں کے لئے ہے جنمیں یہ فطرتی جذبہ موجود ہے گو کمزور ہو اور جو لوگ فاقد الفطرۃ ہیں یعنی جنہوں نے یہ جذبہ بالکل فنا کردیا ہے ان کو تو ہزار نبی کی دعوت بھی مفید نہیں ہوسکتی۔ مثلاً جس مریض کا مرض لاعلاج ہوچکا ہو اس کو کسی طبیب کا علاج مفید نہیں ہوسکتا اور مفید نہونے کی وجہ سے کوئی عاقل طبیب پر بھی اعتراض نہیں کرسکتا کہ مفید کیوں نہیں ہوا، اسی طرح اگر فاقد الفطرۃ لوگ نبی کی تعلیم سے مستفید نہ ہوسکیں اور امراض روحانیہ سے صحتیاب نہوں تو نہ تو نبی پر اعتراض ہے نہ اس کی تعلیم پر بلکہ ایسے لوگوں کو نبی کی تعلیم مضر پڑتی ہے اور نبی کی تعلیم کے بعد ان کا کفر اور ترقی کرجاتا ہے کیونکہ تعلیم نبی بمنزلہ غذائے صالح کے ہے جو حفظ صحت کی موجب ہوتی ہے لیکن نہ ہر شخص کے لئے بلکہ اس شخص کے لئے جس کے بدن میں اصلِ صحت موجود ہو اور جس شخص کی اصلِ صحت خراب ہوچکی ہو اور اس کا بدن اخلاط فاسدہ سے پُر ہو اس کے لئے زیادتی مرض کا باعث ہوجاتی ہے جیساکہ مولانا روم صاحب فرماتے ہیں سے ہرچہ گیرد علتی علت شود۔ اور اسی کی طرف اشارہ ہے آیت وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا، اور آیت يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا الخ میں مثلاً اگر کسی بیمار کو زردہ یا اور کوئی عمدہ غذا کھلائی جائے تو اس کی بیماری اور بڑھ جائے گی۔ اور چونکہ ایسے فاقد الفطرۃ لوگوں کا علم سوا خداوند تعالی کے کسی کو نہیں ہوتا اس لئے تبلیغ عام کیجاتی ہے اس کے بعد فاقد الفطرۃ محروم رہتے ہیں اور جنمیں یہ فطرتی جذبہ موجود ہوتا ہے وہ مستفید ہوتے ہیں۔

تیسرا مقدمہ ۔ مذہب اُن اصول و فروع کے مجموعہ کا نام ہے جو انسان کے اس خدا شناسی کے فطرتی جذبہ کو عمدہ غذا پہونچا کر قوی کرے اور درجۂ کمال تک پہونچا کر واصل باللہ بنا دے، اجمالاً مذہب کی یہ حقیقت قریب قریب ہر فریق کے نزدیک مسلم ہے اور ہر فریق دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارا مذہب اس امر کی بہترین غذا ہے حتیٰ کہ بُت پرستوں کا بھی یہی دعویٰ ہے جیسا کہ آیت مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اس کی شاہد ہے پس ہر فریق کا مذہب اسکی زعم میں اس اجمال کی تفصیل ہے لیکن عاقل کو خود غور کرنا چاہئے کہ کون سا مذہب واقع میں اس فطرتی جذبہ کے قوی کرنے کی بہترین غذا ہے کیونکہ بہت سی مذاہب ایسے ہیں کہ بجائے قوی کرنے کے وہ اس جذبہ کو فنا کرنیوالے ہیں گو اُن کے پیروان کو اس فطرتی جذبہ کے نشو و نما کی بہترین غذا سمجھتے ہوں پس عاقل آدمی جب مذاہب میں باقاعدہ غور کریگا تو انشاء اللہ تعالیٰ اسکو سوائے مذہب اسلام کے اور کوئی دوسرا مذہب اس امر کا متکفل نظر نہیں آئے گا۔ الحاصل قرآن شریف سے بہتر اس فطرتی جذبہ کی تکمیل کا کوئی دوسرا ذریعہ دنیا میں نہیں ہے،

تنبیہ :۔ مذاہب حقہ کے اختلاف کی مثال اسلام میں ایسی ہے جیسے ایک منزل مقصود تک پہونچنے کے متعدد راستے ہوں۔ وہ سب کے سب اس منزل تک پہونچانے میں متحد ہوتے ہیں گو اپنی اپنی شخصیت کے لحاظ سے مختلف ہوں اور مذاہب باطلہ کی مثال ایسی ہے کہ چند راستے ایسے ہوں کہ کوئی بھی ان میں سے منزل مقصود تک نہیں پہونچتا بلکہ سب کے سب جانبِ مخالف کو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے پیرو اپنے زعم میں یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ یہ سب کے سب منزل مقصود تک پہونچتے ہیں۔ پس یہ لوگ جس قدر چلیں گے اسی قدر منزل مقصود سے دور ہوں گے، اسی طرح اہلِ مذاہب باطلہ جس قدر اتباع مذہب زیادہ کریں گے اسی قدر خدا سے زیادہ دور ہوں گے اور اہل مذاہب حقہ جس قدر پابندی مذہب زیادہ کریں گے اسی قدر خدا سے زیادہ قریب ہوں گے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفاتحۃ

یہ سورت مکی ہے یعنی مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے اور اس کی سات آیتیں ہیں۔

مقدمہ

مقدمہ میں تین چیزوں کا بیان ہے، ۱ ہدایت قاری کے متعلق۔ ۲ سورہ فاتحہ کا اجمالاً خلاصہ ۳ سورہ فاتحہ کے چند اسماء۔

ہدایت:۔ قاری قرآن کو لازم ہے کہ جب قرآن شریف پڑھنے کا ارادہ کرے تو بموجب آیت فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ الخ پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور اس کے بعد حسب حکم آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انہ قال اول ما نزل جبریل علیہ السلام علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یا محمد استعذ ثم قل بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ کذا فی روح المعانی فی تفسیر سورۃ العلق۔ کیونکہ قرأت قرآن بہترین عبادت و افضل ترین عمل ہے اور شیطان لعین انسان کا سخت دشمن ہے ہر عبادت اور ہر ایک نیک عمل سے روکنے کی پوری کوشش کرتا ہے اور اس سے بچنا بہت مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہے برخلاف باقی دشمنوں کے کہ انسان اُن سے بچنے کیلئے آلات حرب و دیگر اسباب کام میں لاسکتا ہے اسلئے کہ وہ نظر آتے ہیں لیکن اس لعین کے مقابلہ میں تمام آلاتِ حرب و دیگر اسباب کالعدم ہیں مثلاً انسان اس سے بچنے کیلئے کسی سنگین سے سنگین قلعہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہو تو بیکار اور اگر توپ بندوق یا تلوار وغیرہ اپنے پاس رکھکر بیٹھے کہ آتے ہی مردود کو اڑادوں گا تو بالکل عبث اسلئے کہ کوئی ایسا قلعہ یا مکان نہیں جسمیں یہ حضرت جی نہ پہونچ سکیں اور کوئی ایسا ہتھیار نہیں جو اس پر کارگر ہوسکے کیونکہ ہتیاروں کا کارگر ہونا موقوف ہے نظر آنے پر اور یہ ملعون بموجب آیت اِنَّہٗ یَرٰکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ نظر ہی نہیں آتا، اور ہم کسی وقت اسکی نظر سے غائب نہیں

ہو سکتے اور یہ یعین بموجب فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کی طرح انسان کی رگ رگ میں گھس جاتا ہے پس اس کے اغواء سے بچنے کی سوا اس کے اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ انسان رحمتِ خداوندی کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو۔ اس لئے ربّ العزت نے ہمارے عجز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے استعاذہ و استعانت باسم اللہ کو تجویز فرمایا اور ان دونوں امر سے جو اصل مقصود ہے یعنی توکل علی اللہ وہ تو واجب ہے اور ان دونوں کا زبان سے کہہ لینا مسنون و مندوب ہے۔

خلاصہ سورۂ فاتحہ

تعلیم طریقۂ عرض و درخواست بجناب ربِّ ارض و سماوات

سورۂ فاتحہ کا اجمالاً حاصل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس سورت میں بندوں کو اِستدعا کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے کہ میرے دربار میں اس طرح عرض و درخواست کیا کریں۔ اسی وجہ سے اس سورت کے ناموں میں سے ایک نام سورۂ تعلیم المسئلہ بھی ہے۔ جیسا کہ بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ رعایا کے لئے عرض و درخواست کا طریقہ و قانون مقرر کر دیا کرتے ہیں اور یہ بھی ایک گونہ رحمت و شفقت ہے رعایا پر، تو بھلا ارحم الراحمین کی رحمت کو یہ کب گوارا تھا کہ اپنے بندوں کو اس سے محروم رکھے اور تفصیل اس اجمال کی انشاء اللہ عنقریب آنیوالی ہے

اسماءِ سورۂ فاتحہ:۔ اس سورت کے بہت سے نام ہیں۔ ان میں سے چند نام بغرض افادہ ذکر کئے جاتے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ[1] اس لئے کہ کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کا شروع و افتتاح اس سے ہوتا ہے اور تمام نمازوں میں ہر رکعت کا افتتاح و ابتدا اسی سے ہوتا ہے وغیر ذلک۔ سورۃ الحمد[2] اس لئے کہ اس سورت کی ابتداء لفظ حمد سے ہوئی ہے، سورۃ الشکر[3] اس لئے کہ حمد بھی ایک اعلیٰ فرد ہے شکر کا۔ سورۃ الکنز[4] اس لئے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ یہ سورت اس خزانہ میں سے نازل ہوئی ہے جو عرش الٰہی کے نیچے ہے۔ سورۃ المناجات[5] اس لئے کہ نمازی اس سورت کو بطور مناجات خداوند تعالیٰ کے دربار

میں پیش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو منظور فرما کر دنیا وآخرت کے مصائب سے نجات دیتا ہے، سورۃ التفویض اس لئے کہ اس میں استعانت کو خاص رب الخرت کی تفویض میں دے دیا گیا ہے سورۃ الشفا اسلئے کہ حدیث شریف میں ہے کہ سورۃ فاتحہ شفاء ہے ہر بیماری سے سورۃ الصلوٰۃ اس لئے کہ نماز میں اس کا پڑھنا ضروری ہے سبع المثانی اس لئے کہ اس سورت کی سات آیتیں ہیں اور ہر نماز میں مکرر پڑھی جاتی ہیں سورۃ تعلیم المسئلہ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کے دربار میں سوال اور درخواست کرنے کا طریقہ اس میں تعلیم کیا گیا ہے، جس کی مکمل تشریح عنقریب آنے والی ہے۔ اُمّ الکتاب و اُمّ القرآن اس لئے کہ یہ سورت قرآن شریف کا مبدأ اور اصل ہے اور قرآن شریف کے تمام مضامین پر مشتمل ہے،

اس سورت کے نام کچھ اور بھی ہیں جو ذکر نہیں کئے گئے صرف گیارہ ناموں پر اکتفا کیا گیا ہے اور ہر نام کی وجہ بھی بہت ہی مختصر لفظوں میں ذکر کی گئی ہے، اگر تمام ناموں کے استیعاب اور ہر نام کی وجہ کی تفصیل کا شوق ہو تو تفسیر عزیزی میں ملاحظہ فرما لیا جاوے۔

التفسیر

اب سورۂ فاتحہ کی تفسیر شروع ہوتی ہے۔ قولہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ترجمہ سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں۔ چند باتیں اس مقام پر قابل ذکر ہیں (۱) حمد کے معنی ثناء و تعریف کے ہیں اور وہ ہمیشہ ایسے فعل پر ہوتی ہے جس کا کرنا اور نہ کرنا محمود کے اختیار میں ہو اور اچھا بھی ہو یعنی نہ تو بُرے فعل پر حمد ہوتی ہے گو اختیاری ہو اور نہ ایسے فعل پر جس کا کرنے والا مضطر و مجبور ہو پس اس تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال اچھے بھی ہیں اور وہ اُن کے کرنے نہ کرنے میں مختار بھی ہے ورنہ مستحق حمد نہ ہوتے، پس جو لوگ نعوذ باللہ خداوند تعالےٰ کو افعال میں مضطر و مجبور مانتے ہیں جیسے فلاسفہ اُن کے مذہب کا بُطلان واضح ہو گیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ جیسے سورج روشنی دینے میں مجبور ہے اگر اپنی روشنی کو روکنا چاہے تو روک نہیں سکتا اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے افعال میں مجبور محض ہیں۔

(۲) یہ شبہ نکیا جاوے کہ الحمد للہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی لائق حمد نہیں حالانکہ اور لوگوں کی بھی ان کے افعال اختیاریہ پر حمد ہوتی ہے اور شرعاً اس کی ممانعت بھی نہیں کی گئی جواب یہ ہے کہ یہ حمد بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد ہے کیونکہ اس فعل پر قدرت اور اس کے اسباب وغیرہ سب کا دینے والا وہی ہے۔

(۳) یہ قول یعنی الحمد للہ بمنزلہ دعوٰی کے ہے آگے اس کی دلیل آتی ہے۔

قولہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ترجمہ جو مربّی ہیں ہر ہر عالم کے۔ مخلوقات کی ہر ہر جنس کو عالم کہا جاتا ہے مثلاً عالمِ ملائکہ، عالمِ انسان، عالمِ جن وغیرہ اسواسطے عالمین لایا گیا جو جمع ہے عالم کی، اور یہ قول یعنی ربّ العلمین بمنزلہ دلیل کے ہے دعوٰی سابقہ کے لئے یعنی اللہ تعالیٰ اس لئے مستحق حمد ہیں کہ انہوں نے اپنے اختیار سے تمام جہان والوں کی تربیت اپنے ذمہ رکھی ہے اور تربیت کے معنی ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ کمال تک پہونچانا اسکی تمام ضروریات بہم پہنچاکر۔ پس حاصلِ دلیل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے مستحق حمد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تمام مخلوقات کی ضروریات کا ٹھیکہ لے لیا ہوا ہے اور یہ دلیل ایک ایسے مقدمہ پر مشتمل ہے جو فطرت انسانی میں ودیعت رکھا گیا ہے کوئی ذی عقل اس کا منکر نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات لوگوں کی زبان پر جاری رہتا ہے (یعنی جس کا کھائے۔ اُس کا گائے) ۔جب صرف کھانا کھلانے سے مستحق حمد ہونا فطرت انسانی کے مسلمات میں سے ہے تو جس ذات نے تمام ضروریات کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اس کے مستحق حمد ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

(فائدہ) انسان چونکہ فطرۃً اپنی تمام ضروریات میں محتاج ہے معطی اور مربّی کا۔ اس لئے اسکو سب سے پہلے اسبات کی تعلیم دیجاتی ہے کہ تمام ضروریات میں ربُّ العالمین ہی کا دروازہ کھٹکھٹایا کرے کیونکہ سب کا معطی و مربی اسی کی ذات بابرکات ہے **اعتراض** اگر کوئی ناواقف کہے کہ یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ ہم نے کبھی نہ تو اللہ تعالیٰ کو کسی کو رزق دیتے دیکھا اور نہ کبھی کپڑا وغیرہ دیتے بلکہ ہر شخص اپنی ضروریات زراعت، تجارت یا کسی دوسرے حرفہ کے ذریعہ پوری

کرتا ہے تو ربّ العالمین ہونا کیسے صحیح ہوا اور دلیل کی صحت اسی کی صحت پر موقوف ہے، جب یہ صحیح نہیں تو دلیل بھی صحیح نہیں اور جب دلیل صحیح نہیں تو دعوی بلا دلیل قابل سماع نہیں **جواب** یہ اعتراض مبنی ہے سنتُ اللہ سے ناواقف ہونے پر لہذا سنت اللہ کی تشریح کیجاتی ہے تاکہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔

تشریح سنت اللہ۔ تربیت کے بارے میں سنت اللہ یہ ہے کہ ہر چیز کی ضروریات اس کی شان و فطرت کے موافق پوری کرتے ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جو ذرائع و آلات اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نوع کو عطا فرمائے ہیں، اُن کو عمل میں لانے کے بعد حاجت پوری کرتے ہیں۔ مثلاً درخت کو ہاتھ نہیں دیئے کہ کسی چیز کو پکڑ سکے، پیر نہیں دیئے کہ چل سکے، زبان نہیں دی کہ مانگ سکے اس کو صرف جڑیں دی ہیں جن کے ذریعہ سے زمین سے تری کو جذب کر کے تمام بدن میں پہنچا دے تو اس کو روزی حاصل کرنے میں صرف جڑوں کو کام میں لانا پڑتا ہے چلنے پھرنے اور ہاتھ ہلانے اور مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جانوروں کو چلنے کیلئے پیر یا اُڑنے کیلئے پر اور کھانے کیلئے منہ دیا ہے تو ان کو درخت کی طرح ایک جگہ کھڑے رہنے سے روزی نہیں ملے گی بلکہ پر یا پیر وغیرہ جو کچھ اُن کو دیا گیا ہے سب کو عمل میں لانا ہوگا البتہ چونکہ ان کو تجارت و کھیتی وغیرہ کرنے کے ذرائع نہیں دیئے گئے اس لئے ان کے لئے بغیر اس کے قدرت سے روزی تیار کر دی ہے، چلیں پھریں اور قدرتی تیار شدہ روزی کھائیں، اور انسان کو زبان، ہاتھ، پیر، عقل سب کچھ دیا ہے جن کے ذریعہ سے زراعت، تجارت، حرفت، وغیرہ سے روزی کما سکتا ہے، لہذا انسان کو یہ سب چیزیں کام میں لا کر اپنی ضروریات پوری کرنی ہوں گی اور ان چیزوں کو کام میں لانے کے بعد بھی خداوند تعالیٰ ہی ضروریات پوری کرتے ہیں اور ہر شخص کو مقتضائے مصلحت کے موافق دیتے ہیں اور جو شخص ان چیزوں کو کام میں لائے بغیر روزی کا طالب ہو وہ اللہ تعالیٰ پر فعل عبث کا الزام لگاتا ہے جو شانِ خداوندی کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ چیزیں بیکار و عبث پیدا کی گئی ہیں، کسی کام

ہیں لانے کے لئے پیدا نہیں کی گئیں، ہاں اگر کسی شخص کی عقل سلب کرلیں تو اس کو بغیر ان ذرائع کے روزی وغیرہ پہونچاتے ہیں کیونکہ وہ مسلوب العقل ہونے کی وجہ سے جانوروں کے حکم میں ہوگیا ہے پس جو شخص بغیر ان ذرائع کے حاجات پوری کرنے کا طالب ہے وہ حقیقت میں اس امر کا طالب ہے کہ مجنون ہوتا یا جانور ہوتا کہ تجارت وغیرہ کئے بغیر روزی وغیرہ ملجاتی تو یہ خیال اس کو مبارک ہو کوئی سمجھدار اس کو پسند نہیں کرسکتا۔

اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ تمام ضروریات اللہ تعالیٰ ہی پوری کرتے ہیں لیکن بواسطۂ ارتکاب اسباب نہ بلا واسطہ مثلاً کاشتکار صرف اتنا کرسکتا ہے کہ زمین کھود کر بیج بکھیر دے لیکن اس کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ایسے ہی کھیتی تیار ہونے کے بعد بھی اگر وہ چاہیں تو تباہ کرسکتے ہیں اور یہی حال ہے بقیہ اسباب کا یعنی تجارت وغیرہ، اور یہی معنی ہیں آیت وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ کے، الحاصل بواسطہ دینے کو بھی دینا کہتے ہیں مثلاً بادشاہ حکم دیتا ہے کہ فلاں شخص کو خزانہ سے ایکہزار روپیہ دیدو اس کے بعد خزانچی اسکو ایکہزار روپیہ دیدیتا ہے تو کوئی شخص اس دینے کو خزانچی کا دینا نہیں کہتا بلکہ بادشاہ ہی کا دینا کہا جاتا ہے اگرچہ لینے والے کو بادشاہ کی صورت تک دیکھنا بھی نصیب نہو پس دلیل صحیح ہوگئی اور دعویٰ ثابت ہوگیا۔

تنبیہ:۔ یہ سنت الٰہیہ تو بطور عادت کے ہے اور بعض اوقات اس کے خلاف بھی واقع ہوتا ہے جیسے بنی اسرائیل کو من و سلویٰ کا ملنا اور حواریین پر مائدہ کا نازل ہونا اور بعض متوکلین میں بھی ایسا دیکھا جاتا ہے لیکن یہ معجزہ یا کرامت کہلاتا ہے لہذا یہ سُنّت کے منافی نہیں کیونکہ سنّت عادت ہے اور یہ خرق عادت ہے اور معجزہ یا کرامت ہمیشہ خرق عادت کے طور پر ہوتا ہے اور گاہے گاہے خلاف عادت سرزد ہونے سے عادت کی نفی نہیں ہوا کرتی۔

قولہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ترجمہ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ یہ دونوں

صفتیں تتمہ ہیں تربیت کا اور تربیت کے لوازم میں سے ہیں کیونکہ مُربّی میں جب تک رحمت و شفقت اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہو تو تربیت کی تکمیل ناممکن ہے تو حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ مربی کامل بلکہ اکمل ہیں کیونکہ وہ اعلیٰ درجہ کے شفیق و مہربان ہیں اور اُن کی رحمت کاملہ اور شفقت عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ تربیت عباد میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑیں۔

فائدہ:۔ انسان دنیا میں آتے ہی تربیت ظاہری میں دو مربیوں کا محتاج ہوتا ہے، یعنی والد اور والدہ کا اور دونوں مربیوں کی رحمت و شفقت کی نوعیت جدا جدا ہے، باپ کی رحمت عامّہ ہے اور ماں کی رحمت خاصّہ ہے یا یوں کہا جاوے کہ باپ کی رحمت کلیّہ ہے اور ماں کی رحمت جزئیہ، باپ کی رحمت بڑے بڑے اُمور کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور ماں کی رحمت چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف، باپ تو یہ چاہتا ہے کہ بچّے کی عام زندگی اور امور کلّیہ کی اصلاح ہو خواہ اس کو اُمور جزئیہ میں تکالیف برداشت کرنی پڑیں لیکن یہ ایسا لائق ہو جاوے کہ اس کی عام زندگی کارآمد ہو جائے اور عزّت سے بسر کرے اور والدہ کی توجہ خاص زندگی اور اُمور جزئیہ کی طرف ہوتی ہے مثلاً بچّہ بھوکا نہ رہے، اس کا کپڑا خراب نہ ہو اسکو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو حتیٰ کہ اگر باپ بھی کسی وقت مارنے لگتا ہے تو برداشت نہیں کر سکتی بلکہ فوراً بچانے کی کوشش کرتی ہے اور باپ سے ہر وقت بچّے کے کپڑے جوتی وغیرہ کی فرمائش کرتی رہتی ہے اور اگر اُستاد دیر میں چھٹی دیتا یا مارتا ہے تو اس کو بھی کوسنے دیتی ہے بخلاف باپ کے کہ وہ خود بھی مار پیٹ سے کام لیتا ہے اور اُستاد کو بھی وصیت کرتا ہے کہ اس کی خوب خبر لینا اور اس کو وقت سے پہلے چھٹی نہ دینا خواہ بھوکا رہے، الغرض دونوں کی رحمت کی نوعیت جُدا جُدا ہے اور بچّہ دونوں کی رحمت کا محتاج ہے، دونوں مربیوں کے ملنے سے بچّہ کی تربیت کی تکمیل ہو جاتی ہے، بڑے امور کی باپ کے ذریعہ سے، اور چھوٹے امور کی ماں کے ذریعہ سے، لیکن والدین کی رحمت و شفقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ جس قدر بچّے کی ضروریات و حاجات زیادہ ہوتی جاتی ہیں اسی قدر اُن کی رحمت و شفقت کم ہوتی جاتی ہے مثلاً بچّے کی پیدائش

کے وقت بچے کی ضروریات بہت ہی کم ہوتی ہیں صرف ایک پاؤ بھر دودھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بازار سے لانا نہیں پڑتا تو اسوقت والدین بڑے مہربان ہوتے ہیں بڑی بڑی خوشیاں کرتے ہیں اس کے بعد جس قدر اسکی ضروریات ترقی کرتی ہیں اسی قدر والدین کی شفقت تنزل پذیر ہوتی ہے حتی کہ جب جوان ہوجاتا ہے تو اس کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں خصوصًا جبکہ شادی بھی ہوجائے تو صاف جواب دیدیتے ہیں کہ ہم سے نہیں کھلایا جاتا خود کماؤ اور کھاؤ اور اگر وہ خود نہیں کماسکتا تو اس سے سخت نالاں و بیزار ہوجاتے ہیں۔ غرض جب حاجات کی قلت تھی تو رحمت و شفقت زیادہ تھی اور جب حاجات زیادہ ہوگیں تو دونوں مربیوں کی رحمت و شفقت کم ہوگئی حالانکہ زیادہ احتیاجی کے وقت رحمت و شفقت کی زیادہ ضرورت تھی رحمٰن سے مراد رحمت عامّہ یعنی باپ کی نوعیت کی رحمت کا غیر متناہی خزانہ اور رحیم سے مراد رحمت خاصّہ یعنی ماں کی نوعیت کی رحمت کا غیر متناہی خزانہ، اور ان دونوں صفتوں کو دو غرضوں کے لئے ذکر کیا گیا ہے، اوّل یہ کہ لے انسان جس مربّی کا دروازہ تجھے اب دکھایا جاتا ہے وہ اکیلا دو کے قائم مقام ہے لہذا تجھے امور عظام و امور صغار یعنی چھوٹی بڑی سب ضرورتوں میں اسی کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ دوم یہ کہ والدین باوجود دو ہونے کے حاجات کی زیادتی کے وقت دستِ شفقت کھینچ لیتے ہیں اور ان کی رحمت و شفقت کم ہوجاتی ہے لیکن اس مربّی کی رحمت کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ جس قدر حاجات بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر اس کی رحمت و شفقت بھی ترقی پر آتی ہے اور کسی کو اپنے دروازہ سے رد نہیں کرتا اور بے مانگے دینے کے لئے تیار ہے اور وہ ایسا مہربان ہے کہ ایسوں کو بھی کھلاتا ہے جو اس کو دکھا دکھا کر غیروں کی پوجا کرتے ہیں۔

فائدہ:۔ ان تینوں صفتوں پر مدار ہے بقاءِ عالم کا یعنی رب[۱] العلمین، الرحمٰن[۲]، الرحیم[۳] اگر اللہ تعالیٰ تمام عالم کو فقط پیدا کردیتا اور تربیت کا ٹھیکہ نہ لیتا تو عالم فنا ہوجاتا ہرگز باقی نہ رہتا۔ بقائے عالم کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی یہ تینوں صفات ہیں۔

قولہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ **ترجمہ** جو مالک ہیں روزِ جزا کے، **فائدہ** روزِ جزا سے مراد قیامت کا دن ہے اُسدن سب کو اپنے اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز بھی تمام امور کی باگ ڈور رب العلمین ہی کے قبضۂ قدرت میں ہوگی اور ایک قراءت میں مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے یعنی بادشاہ ہیں روزِ جزا کے

سوال۔ قیامت کے دن کے ساتھ تخصیص مِلک و مُلک کی کیا وجہ ہے حالانکہ دنیا میں بھی مالک حقیقی تمام اشیاء کے وہی ہیں کیونکہ وہ سب کے خالق ہیں لہذا مالک بھی وہی ہیں اور بادشاہ بھی وہی ہیں۔

جواب۔ اگرچہ دنیا میں بھی حقیقی مالک و بادشاہ وہی ہیں لیکن دنیا میں دوسروں کو بھی بمقتضائے حکمت کچھ حصۂ مُلک و مِلک کا دے رکھا ہے گو وہ بطریق مجاز ہے لیکن آخرت میں کسی دوسرے کا مِلک و مُلک بطور مجاز بھی نہیں ہوگا۔ یہ وجہ ہے تخصیص مِلک و مُلک کی یوم الدّین کے ساتھ۔

حکمت دادن مِلک و مُلک در دُنیا

خداوند تعالیٰ نے تمام مخلوق میں سے حضرت انسان ہی کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اس کو احکام الٰہی کا مکلف بنایا جائے اور اس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے جیسا کہ مقدمہ میں مفصلاً گذر چکا ہے پس اگر بعض اشیاء اس کی مِلک میں نہ دی جاتیں تو دنیا میں نظم ہی قائم نہ رہ سکتا اور بہت سے اعمال کا صدور انسان سے ناممکن ہوتا خصوصاً وہ اعمال کہ جن کا تعلق مال کے ساتھ ہے یا ذبح حیوانات کے ساتھ یا اعطاء صدقات کے ساتھ یا ادار نفقات کیساتھ ہے اسی طرح بدون حکمرانی و بادشاہت کے اُن اعمال کا صدور ناممکن ہوتا جو سیاست رعیت کے ساتھ یا معاملہ ممالیک کیساتھ تعلق رکھتے ہیں پس بنا بر مقتضائے حکمت تکلیف دنیا میں مِلک و مُلک دینے کی ضرورت واقع ہوئی تاکہ بروزِ جزا یہ عذر نکر سکیں کہ بوجہ مِلک و مُلک نہ ہونے کے یہ اعمال نہیں ہو سکے اور چونکہ قیامت کا دن اعمال کے بدلہ دینے کا وقت ہے

اعمال کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اس لئے اُس روز کسی کو ملک و مُلک دینے کی ضرورت نہیں اور اسی نکتہ کی وجہ سے اس جگہ قیامت کے دن کو یوم الدین سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یوم الجزار کے ہیں یوم القیامتہ یا یوم البعث یا یوم النشور وغیرہ سے تعبیر نہیں کیا گیا حالانکہ یہ سب نام قیامت کے دن کے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قیامت کے روز مِلک و مُلک کے خاص ہونے اور دنیا میں خاص نہ ہونے کی وجہ کی طرف اشارہ ہو جائے۔

فائدہ ۔ اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے الحمد للہ کے بعد اپنی تین صفتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ۱ صفت ربوبیت ۔ ۲ صفت رحمت ۔ ۳ صفت جزا اور ان تینوں صفتوں کے لانے میں یہ نکتہ ہے کہ دنیا میں جو کوئی کسی کی حمد و ثنا کرتا ہے وہ تین حال سے خالی نہیں ہوتی یا اسوجہ سے کہ گذشتہ زمانہ میں پرورش پائی ہو اور اس کا نمک کھایا ہو اگرچہ بالفعل اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہو اور نہ آیندہ کسی فائدہ کی توقع ہو یا اس وجہ سے کہ بالفعل اس سے انتفاع حاصل ہے اگرچہ گذشتہ زمانہ میں اس سے کوئی نفع نہ اُٹھایا ہو اور نہ آیندہ انتفاع کی توقع ہو یا اسوجہ سے کہ آیندہ اس سے نفع کی توقع ہو اگرچہ زمانہ ماضی و حال میں اس سے منتفع نہیں ہوا پس ان تینوں صفتوں کے لانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر میرے بندے گذشتہ نعمتوں پر نظر کریں تو تب بھی میں مستحق حمد ہوں کیونکہ صفت ربوبیت میری ثابت ہے اور میری سابقہ نعمتیں ان پر بے شمار ہیں اور اگر ان نعمتوں کی طرف نظر کریں جو بالفعل ان پر ہو رہی ہیں تو بھی میں مستحق حمد ہوں کیونکہ میں رحمٰن و رحیم ہوں اور بالفعل بھی میری نعمتوں سے مالامال ہیں اور اگر آیندہ کی طرف نظر کریں تو بھی میں مستحق حمد ہوں کہ مالک یوم الدین ہوں اور جزائے اعمال کی باگ ڈور میرے ہی قبضۂ قدرت میں ہے غرض ہر حال میں مستحق حمد ہوں۔

فائدہ :۔ یہاں تک اُن صفات کا بیان ختم ہو گیا جو دعوی الحمد للہ کے لئے بمنزلۂ دلیل تھیں اور حاصل مقام یہ ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا دنیا میں بھی محتاج ہے اور آخرت میں بھی، اور اللہ تعالیٰ کی تربیت و بادشاہت مخصوص بالدنیا نہیں ہے بلکہ دنیا و آخرت دونوں میں ہے

اور غیر محدود ہے پس انسان کو لازم ہے کہ اُسی کے دروازے پر مرمٹے۔
قولہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ترجمہ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ صفات مذکورہ بالا کے ذریعہ سے جب انسان کو اس بات کا صحیح علم ہو گیا کہ میری تمام ضروریات خواہ اس عالم کی ہوں یا عالم آخرت کی ہوں سب خداوند تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں تو اسکی شرافت وفراست دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس ذات باری کو مخاطب ہو کر عرض کرے کہ میں آپکی ذات پاک کے سوا کسی کو قابل عبادت نہیں سمجھتا اور آپکی عبادت کیلئے ہر وقت سر تسلیم خم ہے **(فائدہ)** عبادت کے معنی ہیں غایت درجہ کی عاجزی اور تذلل یا یوں کہا جائے کہ غایت درجہ کی تعظیم۔ حاصل دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے اسلئے کہ جب آپنے کسی کی غایت درجہ کی تعظیم کی تو اس کے آگے غایت درجہ کی عاجزی اور تذلل ظاہر کیا اور جب کسی کے آگے غایت درجہ کی عاجزی اور تذلل ظاہر کیا تو اسکی غایت درجہ کی تعظیم کی، مثلاً اس سے زیادہ تذلل اور تعظیم کیا ہو گی کہ انسان اپنے چہرہ کو جو اشرف الاعضاء ہی خاک پر رکھدے جو ارذل الاشیا ہی ہر ایک کے پیروں میں روندی جاتی ہی اور وہ بھی اس کیفیت سی کہ پہلے اسکو دھو کر صاف کر کے پھر خاک پر رکھے پس عبادت فقط ایسی ذات کے ساتھ مخصوص ہونی چاہیے کہ جس کا احسان بھی غایت درجہ کا ہو جس سے اوپر کوئی درجہ احسان کا نہو اور ایسا احسان فقط ذات باری عز اسمہٗ کا ہے، اور کسی کا نہیں ہی۔ لہذا عبادت بھی سوائے اُن کے کسی دوسرے کا حق نہیں اسلئے اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں بذریعہ تقدیم مفعول یعنی ایاک عبادت کا حصر کر دیا گیا ذات باری میں۔ باقی رہی یہ بات کہ خداوند تعالیٰ کا احسان اوروں کے احسان سے اعلیٰ کیوں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہی کہ احسان وہ اعلیٰ ہوتا ہے جسمیں احسان کنندہ بدلہ لینے کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو بدلہ لینا تو درکنار رہا اور جس احسان کا بدلہ لیا جاوے یا لینے کا ارادہ ہو وہ بہت گرا ہوا احسان ہے۔ پس اس قاعدہ کے موافق خداوند تعالیٰ کا احسان سب سے اعلیٰ ہے کیونکہ وہ اپنے احسان میں کبھی بدلہ لینے کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ ہی انکو کسی کے بدلہ کی ضرورت اور ماسوا ان کے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو بدلہ لینے کا ارادہ نہ رکھتا ہو خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اُخروی کیونکہ انبیاء علیہم السلام جیسی مخلص ہستیاں بھی اگرچہ دنیا میں اپنے احسان کے بدلے کے طالب نہیں ہوتے لیکن اُخروی بدلے کے

وہ بھی طالب ہوتے ہیں حتی کہ والدین سے بڑھکر انسان کے حق میں کوئی ہستی مہربان نہیں ہوتی لیکن ان کا احسان بھی بے بدلہ نہیں ہوتا بلکہ اولاد کی پرورش کیساتھ مختلف طرح کے اغراض وابستہ رہتے ہیں جو محتاج بیان نہیں اور کچھ نہیں تو دل بہلانے کا فائدہ تو ضرور حاصل کرتے ہیں چھوٹے بچے کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں جنکو وہ صحیح طور پر ادا بھی نہیں کر سکتا انکو سنکر والدین کو اسقدر فرحت ہوتی ہے جو ہزار ہا روپیہ سے بھی نہیں ہوسکتی بلکہ حقیقت میں والدین وغیرہ کے احسانات بھی خداوند تعالےٰ ہی کے احسانات ہیں اس لئے کہ سب کے دل میں رحمت و شفقت وہی ڈالتا ہے جسکی وجہ سے وہ احسان کرتے ہیں (فائدہ) ایسے محسن کی عبادت کو کوئی شخص ذلت نہیں کہہ سکتا بلکہ باعث عزت ہے اور غیر کی عبادت تو سراسر ذلت اور اپنی عزت کو خاک میں ملانا ہے لہذا کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ ماسوی اللہ کے آگے سربسجود ہو اور اپنی عزت کو خاک میں ملادے البتہ جس شخص نے اپنی فطرت سلیمہ کو تباہ کردیا ہے اس سے تعجب نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کے آگے سربسجود ہو کر اپنی عزت کو برباد کرے اس مسئلہ کی مزید تشریح انشاء اللہ تعالی آگے آئیگی۔

قولہ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ترجمہ اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔

یعنی جب ہم کو معلوم ہوگیا ہے کہ تمام امور کی باگ ڈور آپ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے تو پھر ہم غیر کے آگے کیوں ہاتھ پھیلانے لگے بلکہ ہم تو ہر حال میں آپ ہی کی مدد کے طالب ہیں۔

فائدہ :- استعانت سے مراد یا تو خاص استعانت ہے یعنی استعانت فی العبادۃ بقرینۂ ذکر عبادت تو اس صورت میں حاصل مطلب یہ ہوگا کہ جس عبادت کا التزام ہم نے إِيَّاكَ نَعْبُدُ میں کیا ہے اس میں آپ کی مدد کے طالب ہیں بدون آپ کی مدد کے اس کی تکمیل ناممکن ہے، اور یا مراد عام استعانت ہے عبادت میں ہو یا غیر عبادت میں تو اس صورت میں حاصل مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہر کام میں آپ ہی کی مدد کے طالب ہیں بدون آپ کی مدد کے ہم کسی کام کو انجام نہیں دے سکتے

سوال :- إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ بوجہ مفید حصر ہونیکے صاف طور پر دلالت کرتا ہے کہ غیر اللہ

سے مدد لینا ناجائز ہے حالانکہ اکثر امور میں دنرات مدد لی جاتی ہے اور انبیاء علیہم السلام اور دیگر اہل اللہ سے بھی اس کا وقوع ہوتا رہا ہے مثلاً کسی طبیب یا ڈاکٹر سے علاج کرانا یا حکام سے مدد لینا وغیرہ وغیرہ

جواب :- استعانت دو قسم ہے، ایک یہ کہ غیر اللہ پر اعتماد رکھکر اور اسکو مؤثر بالذات سمجھکر مدد لینا یہ ناجائز ہے اور اسی کی نفی ہے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں دوسرے یہ کہ اعتماد تو فقط اللہ ہی کی ذات بابرکات پر ہو اور اسی کو مؤثر بالذات سمجھکر غیر سے استعانت ظاہری طلب کرنا یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ جس اعانت کا خداوند تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اس کے مظاہر میں سے یہ بھی ایک مظہر ہے مثلاً طبیب سے علاج کرانا یہ اعتقاد رکھکر کہ شفاء تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے لیکن یہ علاج بھی ایک مظہر ہے شفاء خداوندی کا تو یہ استعانت شریعت میں بھی جائز ہے اور اسی کا صدور انبیاء علیہم السلام و دیگر اہل اللہ سے بھی ہوا ہے اور یہ حقیقت میں استعانت بالغیر نہیں بلکہ استعانت باللہ ہی میں داخل ہے اور اسی کا ایک فرد ہے

فائدہ :- دنیا میں تین فرقے ہیں۔ ۱ جبریہ یہ فرقہ اعتقاد رکھتا ہے کہ انسان کچھ اختیار نہیں رکھتا بلکہ مجبور محض ہے مانند پتھر و لکڑی کے، تمام حرکات و افعال اس سے بے اختیار سرزد ہوتے ہیں۔ ۲ قدریہ اس فرقہ کا یہ اعتقاد ہے کہ انسان کامل اختیار رکھتا ہے بلکہ اپنے افعال و حرکات کا خود خالق ہے، یہ دونوں فرقے مردود ہیں اس لئے کہ پہلا فرقہ تمام شریعتوں کو باطل کرتا ہے اور دوسرا فرقہ خداوند تعالیٰ کی صفتِ خالقیت میں شرکت کا دعویٰ کرتا ہے پس اللہ تعالیٰ نے اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں جبریہ کے عقیدہ کا رد فرمایا ہے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں قدریہ کے عقیدہ کا۔ ۳ اہل السنۃ والجماعۃ یہ فرقہ راہِ راست پر ہے اور اس کا اعتقاد ہے کہ انسان نہ تو پتھر و لکڑی کی طرح مجبور محض ہے اور نہ ہی اپنے افعال کا خالق بلکہ تمام اشیاء کا خالق خداوند تعالیٰ ہے اور انسان کاسب ہے اور کسب میں مختار ہے نہ مجبور محض، اور یہ فرقہ کہتا ہے کہ ہم بندگی کرتے ہیں اور توفیق خداوند تعالیٰ سے چاہتے ہیں۔

قولہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ - ترجمہ بتلا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا، یعنی جب ہم نے اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں عبودیت کا التزام کرلیا تو اس بات کا اقرار ہوگیا کہ خداوند تعالیٰ ہمارے حقیقی مالک و مولیٰ ہیں اور ہم ان کے غلام و مملوک ہیں اور غلام کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ اپنے مالک کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت نہ کرنے پائے لہٰذا ہمارا بھی اہم ترین فریضہ یہی ہے کہ کوئی بات خلاف مرضی رب العزۃ نہ کرنے پائیں اور اس فریضہ کا ادا کرنا موقوف ہے مرضیات الٰہیہ و غیر مرضیات الٰہیہ کے معلوم ہونے پر یعنی ہم کو معلوم ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک کون سے امور پسندیدہ ہیں تاکہ اُن کو کریں اور کون سے امور ناپسندیدہ ہیں تاکہ اُن سے پرہیز کریں اور چونکہ ہم عالم الغیب نہیں ہیں لہٰذا اس علم کا ذریعہ سوا اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ ربّ العزت خود ہم کو مطلع فرماویں۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تعلیم فرمائی ہے کہ تم میرے دربار میں اس بات کی درخواست کرو کہ اے اللہ ہم کو وہ سیدھا رستہ بتلا دو جس میں آپ کی مرضیات و غیر مرضیات کی پوری تفصیل ہو تاکہ اس پر مطلع ہو کر آپ کی خلاف مرضی قدم نہ اُٹھائیں۔

فائدہ:۔ مذہب کی حقیقت اور رُوح مسلّم شدہ (جیسا کہ اوپر مقدمات میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔) یہ ہے کہ انسان کا جو فطرتی تعلق مولیٰ حقیقی کے ساتھ ہے اس کو ایسی غذا پہنچائی جاوے کہ وہ دن بدن قوی اور ترقی پذیر ہو اور جو اشیاء اس تعلق کو کاٹنے یا کمزور کرنے والی ہوں ان سے پرہیز کیا جائے اور یہی مدار ہے حصُولِ قربِ خداوندی اور فوزِ دارین کا، اور یہ حقیقت اِس وقت صرف مذہب اسلام ہی میں پائی جاتی ہے اِس لئے کہ مذہبِ اسلام کے علاوہ دنیا میں دو قسم کے مذاہب ہیں، سماویہ و غیر سماویہ، مذاہب سماویہ گو اپنے اپنے وقت میں یہ حقیقت اور رُوح رکھتے تھے لیکن اس وقت بوجہ منسوخ ہو جانے کے اُن پر عمل کرنا خلافِ مرضئ الٰہی ہے اور ظاہر ہے کہ جو عمل خلاف مرضئ الٰہی ہو وہ خدائی تعلق کے قوی ہونے کا ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اس تعلق کا قاطع ہوتا ہے اور مذاہب غیر سماویہ چونکہ من گھڑت ہیں

خود خداوند تعالیٰ کے بتلائے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لئے اُن کے تمام اصول و فروع خلافِ مرضئ الٰہی ہیں لہٰذا وہ بھی خدائی تعلق کے قوی ہونے کا ذریعہ نہیں بن سکتے بلکہ وہ بھی قاطع تعلق ہیں۔ خدائی تعلق کو قوی بنانے والا مذہب فقط وہی ہو سکتا ہے جو خداوند تعالیٰ ہی کا بتلایا ہوا ہو وہ اس وقت فقط مذہبِ اسلام ہے، اسلام نے ادلّہ سے سورج کی طرح روشن کر دیا ہے کہ میں خداوند تعالیٰ کا بتلایا ہوا مذہب ہوں اور باقی مذاہب والے گو اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارا مذہب بھی خداوند تعالیٰ ہی کا بتلایا ہوا ہے۔ لیکن وہ اس دعوے کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

بعض مدعیانِ اسلام میں یہ غلطی آگئی ہے کہ وہ قرآن مجید کو تو آسمانی کتاب تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب اور طریقۂ عمل از جانب خود تجویز کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا مطلب اور طریقہ عمل اختیار نہیں کرتے کیونکہ یہ لوگ حدیث کو نہیں مانتے اور یہ لوگ اہلِ قرآن کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا طریقہ بھی خلافِ مرضئ الٰہی ہے لہٰذا وہ بھی باطل اور قاطع تعلق خداوندی ہے کیونکہ جس ذات ستودہ صفات پر قرآن شریف نازل ہوا ہے اُس سے بہتر کوئی دوسرا اس کا مطلب اور طریقۂ عمل نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی کا بتلایا ہوا مطلب اور طریقۂ عمل ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، پس جو شخص قرآن شریف کا مطلب اور طریقۂ عمل از جانب خود تجویز کرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے مطلب اور طریقۂ عمل کو اختیار نہ کرے اس کے لئے رضائے مولیٰ کا حصول ناممکن ہے جو روح تھی مذہب کی، الغرض خداوند تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی کرنے اور اُن کی رضا حاصل کرنے کا صحیح ذریعہ فقط مذہبِ اسلام ہے، جس کے اصول و فروع کی تشریح بقدرِ ضرورت خود بانئ اسلام فرما گئے ہیں اور یہی مطلب ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کا، اور یہی صراطِ مستقیم ہے اور قرآن شریف اسی صراطِ مستقیم کی شرح ہے۔

قولہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ، ترجمہ رستہ ان لوگوں کا جنپر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ جب بندوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی کہ صراط مستقیم یعنی راہِ راست کی ہدایت طلب کریں لہٰذا ضروری ہوا کہ ان لوگوں کا ذکر بھی کر دیا جاوے جن کے ذریعہ سے صراط مستقیم بندوں تک پہونچا ہے اور اُن کے اقوال و اعمال کے ذریعہ سے صراط مستقیم غیر مستقیم سے ممتاز ہوا ہے کیونکہ یہ تو سنت اللہ اور شانِ خداوندی کے خلاف ہے کہ ہر کس و ناکس کو مُنہ لگائے اور بلا واسطہ تعلیم دے، لامحالہ بعض ہستیاں اس کام کے لئے منتخب فرما کر ان کے ذریعہ سے صراط مستقیم کی تعلیم فرمائی ہے پس اگر ان ہستیوں کی تعیین نہ کی جائے تو ہر مذہب والا دعویٰ کر سکتا ہے کہ میرا مذہب صراط مستقیم ہے اس لئے خود خداوند تعالیٰ نے **صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ** میں ان ہستیوں کی تعیین فرما دی تاکہ کسی باطل پرست کو اس بات کی گنجائش باقی نہ رہے کہ وہ دعویٰ کر سکے کہ میرا مذہب بھی صراط مستقیم ہے اور آیت **وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ** الخ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے کہ منعم علیہم چار فرقے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام۔ صدّیقین۔ شہداء۔ صالحین۔ صراط مستقیم کی تعلیم عالم غیب سے اولاً انبیاء علیہم السلام کو دیجاتی ہے پھر ان کے ذریعہ سے صدّیقوں کو اور صدّیقوں کے ذریعہ سے شہیدوں کو اور شہیدوں کے ذریعہ سے صالحین کو اور صالحین کے ذریعہ سے عوام مومنین کو۔

قولہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ترجمہ نہ رستہ اُن لوگوں کا جن پر آپکا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے۔ یہ قول ایک شبہ کے رفع کرنیکے لئے اضافہ کیا گیا ہے۔ شبہ یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے آپ کو ان چار گروہ میں سے کسی ایک گروہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اُن کے متّبع ہونے کے مدعی ہوتے ہیں حالانکہ اس گروہ کے صراط مستقیم کو چھوڑ کر شیطانی رستہ میں منہمک ہوتے ہیں پس اسی نسبت کی وجہ سے ان کا شیطانی رستہ لوگونکی نظروں میں صراط مستقیم معلوم ہوتا ہے اور حقیقت میں اسکو صراطِ مستقیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً یہود اس بات کے مدّعی ہیں کہ ہم حضرت

موسیٰ علیہ السّلام کے متبع ہیں اور نصاریٰ مدعی ہیں کہ ہم حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متبع ہیں حالانکہ یہ دونوں جماعتیں ان دونوں پیغمبروں کے رستہ سے کوسوں دُور ہیں اور اس امت میں سے حضرات شیعہ اپنے آپ کو اہلِ بیت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اہلِ بیت کے اخلاق واعمال وعقائد کی ان میں بو تک بھی نہیں ہے وعلیٰ ہذا القیاس اور بہت سے لوگ اور اس وجہ سے صراط مستقیم مشتبہ ہو جاتا ہے غیر مستقیم کے ساتھ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ کو رفع کرنے کے لئے اس قول کا اضافہ فرما کر اس امر کی تعلیم فرمادی ہے کہ صراط مستقیم طلب کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور اہل غضب اور اہل ضلالت کو ہرگز صراطِ مستقیم نہ سمجھنا چاہیئے اگرچہ اپنے آپ کو کسی ایسی جماعت کی طرف منسوب کرتے ہوں جو صراطِ مستقیم پر تھی مثل اولیاء اللہ وانبیاء علیہم السلام کے بلکہ صراط مستقیم کی درخواست میں ان کے باطل رستہ سے احتراز کا اضافہ کیا جاوے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مغضوب علیہم یہود ہیں اور ضالین نصاریٰ ہیں **فائدہ:۔** صراط مستقیم کے چھوڑنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی پوری تحقیق نہ کرے تاکہ اس کی خوبی واضح ہو ضالین سے مراد ایسے لوگ ہیں دوسری یہ کہ باوجود تحقیقات کے اور اسکے صراطِ مستقیم ہونے کا علم ہو جانے کے پھر چھوڑ دے اور یہ چھوڑنا محض ضد وعناد کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مغضوب علیہم سے مراد ایسے لوگ ہیں کیونکہ اچھی طرح جان بوجھ کر خلاف کرنے میں ناراضگی زیادہ ہوا کرتی ہے۔ نصاریٰ عام طور پر پہلی صورت میں مبتلا تھے اور یہود دوسری میں پس حدیث میں یہود ونصاریٰ میں حصر کرنا منظور نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ ضالین سے مراد ایسے لوگ ہیں جو نصاریٰ کے ساتھ اس وصف میں شریک ہوں اور مغضوب علیہم سے مراد ایسے لوگ ہیں جو یہود کے ساتھ اس وصف میں شریک ہوں۔ موجودہ زمانہ کے انگریزی تعلیمیافتہ طبقہ میں نصاریٰ کا رنگ غالب ہے وہ بوجہ جہالت اور لاعلمی کے اسلام سے متنفر ہیں اور اس جہالت کے دُور

کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتے اور مذہبی تعلیمیافتہ طبقہ میں یہود کا رنگ غالب ہے کہ بعض حضرات باوجود تحقیق ہو جانے کے عناداً تسلیم نہیں کرتے

فائدہ:۔ قاری جب سورۂ فاتحہ ختم کرے تو اس کو آمین کہنا چاہیے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب میں سورۂ فاتحہ کی قرات سے فارغ ہوا تو جبرئیل علیہ السلام نے مجھے آمین کی تلقین کی اور کہا کہ آمین مثل مُہر کے ہی کتاب پر۔

اور آمین قرآن شریف میں سے نہیں ہے اسی لئے اس کو قرآن شریف میں ابتک نہیں لکھا گیا اور نہ قیامت تک لکھا جائے گا کیونکہ قرآن شریف میں لکھنے سے کسی ناواقف کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی قرآن شریف میں سے ہی یعنی قرآن شریف کا جزو ہے اور اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کو جہر سے کہنا ترک کر دیا تھا کہ جہر کی صورت میں شبہ مذکور کا اندیشہ تھا اور آمین کے معنی عربی میں اِسْتَجِبْ اور اردو میں (قبول و منظور فرما) کے ہیں یعنی اے اللہ ہماری یہ درخواست منظور فرما کر ہم کو سیدھا رستہ دکھا۔

تشریح بودن سورۂ فاتحہ طریقہ عرض درخواست

سورۂ فاتحہ کی آیات کی تفسیر بقدر ضرورت تو ختم ہو چکی ہے لیکن مقصود بالذات چونکہ اس سورت میں عرض و درخواست کا طریقہ تعلیم فرمانا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کی بھی قدرے تشریح کر دی جائے تاکہ خداوند تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کا حسن و خوبی ہر شخص پر واضح ہو جائے۔

ربّ العزّت نے اس سورت کے تین حصّے کر دئے ہیں، ۱ القاب خداوندی الحمد سے یوم الدین تک، ۲ آداب خداوندی ایاک سے نستعین تک، ۳ اصل درخواست اہدنا سے ضالین تک اس ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ درخواست کنندہ پر لازم ہے کہ جس کے دربار میں درخواست کرنا چاہتا ہے اوّلاً اُس کی شان کا اظہار کرے کہ آپ اس شان کے ہیں۔ اور ثانیاً اسکے ساتھ اپنی نسبت اور تعلق کا اظہار کرے کہ میں آپ سے یہ نسبت اور تعلق رکھتا ہوں اور ثالثاً اصل

درخواست کو پیش کرے کیونکہ اظہارِ شان و اظہارِ نسبت کے بعد درخواست کرنے کو ایک خاص اثر ہے قبولیت درخواست میں جو محتاج بیان نہیں۔

القاب میں اظہارِ شان ہوا کرتا ہے اور آداب میں بیان نسبت و تعلق ہوتا ہے پس الحمد سے یوم الدین تک خداوند تعالیٰ کی عظمتِ شان کا بیان ہے جو مفصل گذر چکا ہے، اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں اظہارِ نسبت و تعلق ہے کہ اے اللہ ہماری آپ کے ساتھ یہ نسبت و تعلق ہے کہ ہم آپ کے بندے اور غلام ہیں اور آپ ہمارے آقا و مولیٰ ہیں اور ہم آپ ہی کے دروازے پر ہاتھ پھیلانے والے ہیں کوئی دوسرا دروازہ اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اس پر ہاتھ پھیلائیں، کیا یہ ممکن ہے کہ اس عظمتِ شان اور اس تعلق و نسبت کو دل سے ظاہر کرنے کے بعد کوئی شخص رب العزت کے دربار میں ہاتھ پھیلائے اور پھر ناکام رہے رحمتِ خداوندی ہرگز اس کو گوارا نہیں کر سکتی۔ اِہْدِنَا سے آخر سورۃ تک اصل درخواست ہے جسکی تشریح مفصل گذر چکی ہے اور لفظ آمین چونکہ سورت کا جزو نہیں ہے۔ لہذا اس کو بمنزلہ "زیادہ آداب وغیرہ" کے سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی اصل مضمون میں داخل نہیں ہوتا بلکہ اصل مضمون کے ختم ہونے کے بعد اس قسم کے الفاظ لکھے جاتے ہیں اور مقصود قبولیتِ درخواست کی ترغیب ہوتا ہے۔ اسی طرح مقصود آمین سے بھی یہی ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اور یہ تقسیم و تشریح سورۂ فاتحہ کی خود خداوند تعالیٰ نے بزبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمائی ہے جو احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ مسلم شریف میں ہے قال اللہ تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی واذا قال الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قال اللہ عزوجل اثنی علی عبدی فاذا قال مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ قال مجدنی عبدی وقال مرۃ فوض الی عبدی فاذا قال اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ما سأل فاذا قال اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ قال ھذا لعبدی ولعبدی ما سأل اس حدیث میں (الصلوٰۃ) سے مراد باتفاق علماء سورۂ فاتحہ ہے۔

فائدہ ہر شخص کے القاب وآداب بسبب بدل جانے درخواست کنندگان کے بدلتے رہتے ہیں کیونکہ ہر شخص کسی سے منصب میں چھوٹا ہے اور کسی سے بڑا ہے اور کسی کے برابر ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کے درخواست کنندہ کوئی بھی ہو اُن کے القاب وآداب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اس لئے کہ اُن کے ساتھ سب کو ایک ہی نسبت ہے کہ وہ سب سے شان میں بڑے اور سب اُن سے چھوٹے ہیں نہ کوئی ان سے شان میں بڑا ہے اور نہ کوئی ان کے برابر ہے پس سب ان کی شان کے مقابلہ میں حقیر ہیں حتیٰ کہ ہفت اقلیم کا بادشاہ بھی اُن کے مقابلہ میں وہی درجہ رکھتا ہے جو ایک مسکین رکھتا ہے اس لئے ہر درخواست کنندہ کے لئے یہی القاب وآداب تجویز کئے گئے ہیں جو سورۂ فاتحہ میں مذکور ہیں۔ پس جس طرح وہ ذات میں وحدہٗ لاشریک لہٗ ہیں اسیطرح القاب وآداب میں بھی وحدہ لاشریک لہٗ ہیں اسی واسطے یہ القاب وآداب اُنہیں کیلئے مخصوص ہیں کسی دوسرے کیلئے تجویز نہیں کئے جا سکتے۔

فائدہ:- یہ طریقہ درخواست کا نہایت مختصر اور جامع ہے تمام مطالب دُنیویہ واُخرویہ کا اور بہترین ذریعہ ہے حصولِ مطالب کا اس لئے کہ حصولِ مطالب کا مدار ہے رضائے خداوندی پر اور اس سورت میں اس بات کی تعلیم ہے کہ خداوند تعالیٰ سے اس صراطِ مستقیم کا مطالبہ کرو کہ جس پر چل کر خداوند تعالیٰ کو راضی کرلو جب وہ راضی ہو جائیں گے تو سب کچھ بے مانگے ہی دیدیں گے۔ اصل چیز رضائے مولیٰ ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بادشاہ سے کوئی انعام وغیرہ لینا چاہے تو وہ اول اس بات کی تدبیر کرے گا کہ بادشاہ کسی طرح خوش ہو جاوے اس کے بعد وہ خود بخود انعام دے گا تو وہ بادشاہ کی تعریف میں شعر لکھکر بادشاہ کو سنائیگا یا کوئی اور تدبیر خوش کرنے کی نکالیگا۔ بہر صورت خوش کئے بغیر انعام نہیں لے سکتا۔ اسیطرح انعامات الٰہیہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ بھی خداوند تعالیٰ کو خوش کرنا ہے جب وہ خوش ہو جاوینگے تو تمام دنیا ہماری غلام ہے۔ پھر کوئی انعام ایسا نہیں ہوگا جو عطا نہ فرماویں۔

فضائل سورۂ فاتحہ

اس سورت کے فضائل بہت ہیں مختصراً بعض کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبیؓ ابن کعبؓ سے فرمایا کیا تو چاہتا ہے کہ تجھے ایک ایسی سورت کی تعلیم دوں کہ اس جیسی سورت نہ تورات میں نازل ہوئی ہو نہ انجیل میں نہ زبور میں ۔ اور نہ قرآن میں ۔ حضرت اُبیؓ ابن کعبؓ نے عرض کیا کہ ہاں ۔ حضور نے فرمایا کہ وہ سورت ام القرآن (یعنی سورۂ فاتحہ) ہے جو ہر نماز میں پڑھا کرتا ہے بعض روایات میں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہر مرض کیلئے شفا ہے ۔ حضرات صحابہ کرام سورۂ فاتحہ پڑھکر سانپ کے ڈسے ہوئے اور بچھو کے کاٹے ہوئے وغیرہ پر دم کیا کرتے تھے ، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت تھی ۔ بعض روایات میں ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو پڑھکر دم کیا کرتے تھے اور پڑھنے کے بعد لب مبارک مقام درد پر لگا کرتے تھے بعض روایات میں ہے کہ جو شخص بستر پر لیٹ کر سورۂ فاتحہ و قل ہو اللہ احد پڑھکر اپنے اوپر دم کرے وہ ہر بلا سے امن میں رہتا ہے مگر یہ کہ اس کی موت مقدر ہو بعض روایات میں ہے کہ سورۂ فاتحہ دو ثلث قرآن کے برابر ہے ثواب میں بعض کتب میں ہے کہ ابلیس علیہ اللعنۃ کو اپنی عمر میں چار مرتبہ رونے اور سر پر خاک ڈالنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ اوّل جب اس پر لعنت ہوئی ۔ دوم جب آسمانوں سے نکال کر زمین پر ڈالا گیا ۔ سوئم جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ۔ چہارم جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی ۔ یہ سب فضائل تفسیر عزیزی سے نقل کئے گئے ہیں ۔

برادرانِ اہلِ اسلام

کی خدمت میں عموماً اور طلبہ مدارس کی خدمت میں خصوصاً گذارش ہے کہ جناب مولانا مولوی سلطان محمود صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی نے ہم شائقین کے اصرار پر تفسیر قرآن پاک کا سلسلہ شروع کردیا ہے اور ایک حصہ تیار کرکے اس کی اشاعت کی اجازت بھی دیدی ہے جس کو خاکسار نے اپنے اہتمام سے شائع کردیا ہے۔ اور مولانا موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا۔ اور اسی طرح تھوڑا تھوڑا حصہ تیار کرکے شائع کیا جائے گا۔ اُمید ہے کہ دوسرا حصہ بھی ماہ ذیقعدہ تک تیار ہوجائے گا۔ مولانا نے اس تفسیر میں قرآن شریف کے مطالب کی توضیح اس خوبی کے ساتھ کی ہے کہ ہر خاص و عام نہایت آسانی کے ساتھ اس کو سمجھ سکتا ہے۔ شائقین حضرات دُعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق خاص سے مولانا موصوف سے اس کام کی تکمیل کرادیں اور مولانا کی اس خدمت کو قبول فرمالیں

(قیمت ضرورت رسالت (۰۳ آنہ

یہ رسالہ بھی مولانا موصوف کی ایک تالیف ہے۔ اس رسالے میں مسئلہ نبوت و رسالت کے تمام پہلو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے واضح کیے گئے ہیں۔ اور اس رسالے کے دو حصے کردیے گئے ہیں حصۂ اوّل میں مطلق نبوت و رسالت کی تشریح کی گئی ہے۔ جو مشترک ہے تمام انبیاء علیہم السّلام میں۔ اور حصۂ دوم میں خاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الرسل و خاتم الانبیاء ہونے کی تشریح ہے۔ اور ان دونوں حصوں میں اصل مسئلہ کی تشریح کے علاوہ مخالفین اسلام کی تردید بھی نہایت مدلل طریقہ سے کی گئی ہے۔ خصوصاً مرزائیوں اور عیسائیوں کی

(قیمت ساردا بل اور اسلام (ایک پیسہ

یہ بھی مولانا کی تالیف ہے۔ اس رسالہ میں یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ ساردا بل مسلمانوں کے اسلامی قانون کے قطعاً خلاف ہے اور اہلِ اسلام کے حریم عفت کو پارہ پارہ کردینے وا
چیز ہے ہر مسلمان کو ساردا بل کی مخالفت کرکے اسلام کی ہمدردی کا ثبوت دینا چاہیے

اس
کام
خا

مولوی شریف اللہ نائب صدر مدرسہ عالیہ
مسجد فتحپوری۔ دھلی۔